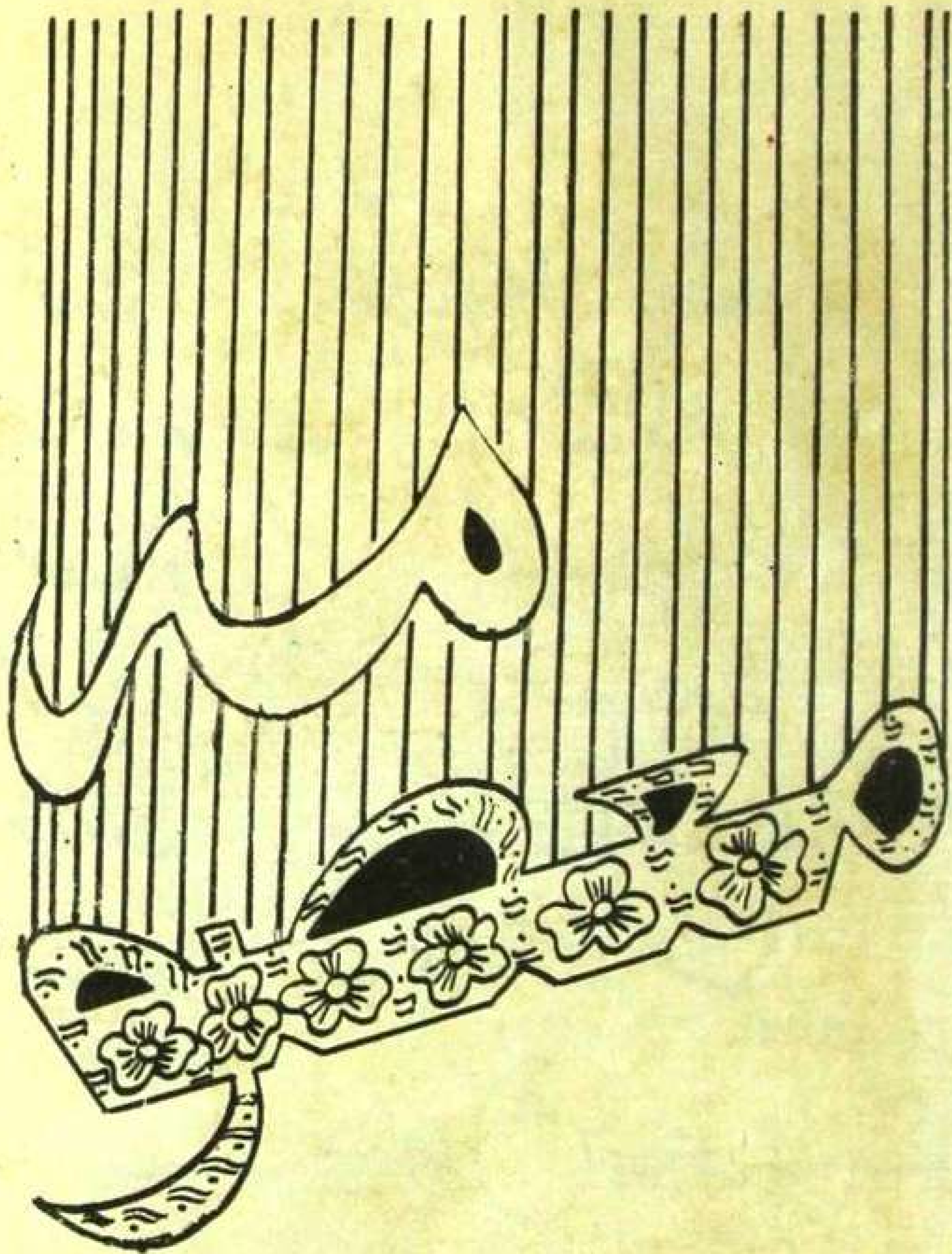
معصومہ



عصمت چغتائی



عصمت
چغتائی

قیمت : تیس روپے

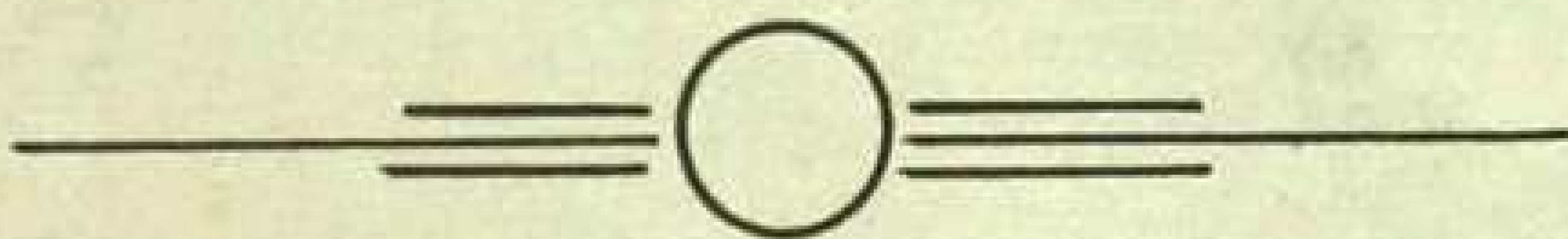
سال اشاعت : سنہ ۱۹۸۸ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : معراج الدین

طباعت : نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد

سرورق : جمیل اختر



ناشر

نصرت پبلشرز

امین آباد لکھنؤ 226018

پیش لفظ

چار مہینے کا مکان کا کرایہ
نوکروں کی تنخواہ ۔ بنیے کا قرضہ
بجلی کا بل ۔ دھوبی کی دھلائی ۔
بچوں کی فیس ۔ پانی سر سے گذر جاتا ہے.
میں ڈوبتے ڈوبتے ابھر کر دیکھتی ہوں.
میری سولہ برس کی جیتی جاگتی بیٹی
نوعمر سہیلیوں کے ساتھ رسّی کود رہی ہے.

عصمت چغتائی

پہلا باب

جی ہاں یہ چرچ گیٹ ہے۔ جی یہاں چرچ تو آس پاس کوئی نہیں، ہاں گیٹ بہت سے ہیں۔ اگر آپ لوکل ٹرین سے اتر کر ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جائیں تو وزن کرنے کی مشین کے پاس سے گذر کر برف کے پیاؤ کو پار کریں گے۔ داہنے ہاتھ کو باہر نکلنے کی چکریاں نظر آئیں گی۔ یہ پھندے ان بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کے لئے ہیں جو ایک دم بچوں اور عورتوں کے ریلے کے ساتھ ٹھسک لیتے ہیں ان چکروں میں سے ذرا قاعدے سے نکلئے گا ورنہ گھٹنے کی چپنی پر وہ مزے دار چوٹ لگے گی کہ کئی دن تک لنگڑانا پڑے گا۔ یہاں آپ کو دونوں کونوں پر دو اکتائے ہوئے ٹکٹ چیکر کھڑے باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ آپ چاہیں تو کوئی پرانا ٹکٹ انھیں تھما دیں۔ یا وزن کا ٹکٹ ہی پکڑا کر چھپ سے نکل آئیں۔ یہ بالکل بے توجہ آپ کے آر پار ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ ذرا دیکھ کے بھائی! عین سیڑھیوں کے نیچے پان کی پیک گھلی ہوئی کیچڑ بہہ رہی ہے۔ آپ چاہے کتنی کھوج لگائیں، یہ پتہ نہیں چلا سکتے کہ اس کیچڑ کا نکاس کہاں سے ہوتا ہے؟ آسمان سے ٹپکتی ہے یا زمین سے سوتا پھوٹتا ہے؟ کوئی اور چھور نظر نہیں آتا۔ داہنے ہاتھ پر دیوار کی طرف منہ کئے آپ کو نچی ہوئی مرغی کی صورت کی ایک سشری متی جی نظر آئیں گی۔ جب تک سورج یا سڑک کے کھمبے کی روشنی رہتی ہے یہ بڑی احتیاط سے ٹٹول کر اپنے چھدرے کھچڑی بالوں میں سے جوئیں اور لیکھیں سونت کر پہلے تو غور سے انھیں پرکھتی ہیں، اس وقت ان کے جھریوں دار چہرے پر فتح مندی کے آثار چھا جاتے ہیں، جیسے غوطہ خور اپنی جان کی بازی لگا کر پانی کی تہہ سے موتی نکال کر لایا ہو، پھر وہ اس ناہنجار جوں

کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخنوں کو لٹا کر دائیں ہاتھ کے ناخنوں سے قتل کر دیتی ہیں۔ اگر آپ انھیں جوں مارتے دیکھیں تو یہی سمجھیں گے کہ وہ بڑی کاریگری سے کسی نازک سے انگوٹھی میں کوئی انمول نگینہ جڑ رہی ہیں۔ جوں کو ٹھکانے لگا کر انکی آنکھوں کی بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ دم بھر کو ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، جیسے انھوں نے ایک موٹی سی جوں نہیں کسی سود خور توندوالے کا صفایا کر دیا ہے۔ ناخون پر جب بہت سی لاشیں چپک جاتی ہیں تو وہ سامنے دیوار پر ناخون رگڑ کر چھڑا دیتی ہیں، پھر نئے سرے سے نئے شکار کے پیچھے انگلیوں کے گھوڑے چھوڑ دیتی ہیں۔ ذرا دیوی جی کے چیتھڑ اور سامان سے بچ کر نکلئے گا، ورنہ آپ کو ایسے گھوریگی جیسے کسی پردہ نشین دوشیزہ کی خوابگاہ میں آپ بے محابہ دڑاکر گھس آئے ہوں!

ذرا دونوں طرف آتی جاتی گاڑیوں سے بچ کر فٹ پاتھ پر آجائیے نا! نالی کی کہنی میں گھٹنا نہ لگنے برادر، ورنہ سر منڈانے والے کے سر پر دافعی اولے برس جائینگے یہ سڑے ہوئے کیلے جو بیچ رہی ہے نا! اس کے پاس پان بیڑی کا خونچہ ہے، ذرا احتیاط سے پھلانگیے ـــ شاباش!

سنکار ہوٹل سے نکلتے ہوئے باسی اڈلی دوسے کے بھبکے سے ناک سمیٹتے ایک اور پر اسرار کیچڑ لانگ کر بھیل پوری والے کی بالٹی پھلانگیے ـــ بالکل ٹھیک! اب ذرا دیوار پر بیٹھے ہوئے نیلم فلم اسٹار کے پالک پچوں کی لاتوں کے دار خالی دیتے، بجری کے ڈھیر سے کاواکاٹ کر سیدھے آر، اے، ملک کی ڈبہ نما دکان سے ٹکرا جائیے۔ ٹھیک! خیر کوئی بات نہیں۔ یہ اے۔ رو ڈ ہے۔

یہاں دو چار گو مٹرے تو آئے دن پڑتے ہی رہتے ہیں۔ بس جی کرٹا کر کے چلے آیئے۔ کیلے کے چھلکوں میں رپٹتے ۔۔ کتوں کی ڈوریوں میں الجھتے ۔۔ باس!

یہ جے ہند کالج کے بالکل سامنے جس بلڈنگ کے احاطے پر سب سے زیادہ بچے لدے ہوئے نظر آئیں وہی انڈس کورٹ ہے۔ بیچ کے پھاٹک کے ایک بازو دیوار پہ آپ کو ادھ کچری لڑکیاں بیٹھی نظر آئیں گی اور دوسری طرف ادنگے بونگے بڑھتے ہوئے لڑکے۔ ان لڑکیوں میں آپ کو مارلن منرو، برژت، باردو اور سینڈرا ڈی کی جھلکیاں نظر آئیں گی اور لڑکے ایلوس پریسلے، جمی ڈین، اور رکی نیلسن کی پرچھائیاں معلوم ہوں گے۔ یہ دیوار انڈس کورٹ میں رہنے والوں کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے: یہیں بیٹھ کر عشق کئے جاتے ہیں، منگنیاں طے ہوتی ہیں، شادیاں ہوتی ہیں اور اس دیوار پر چڑھنے کے لئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس آواگون کے سلسلے سے بے نیاز یہ دیوار پان کی پیکوں اور ووٹ مانگنے والوں کے پروپیگنڈے کا بے زبان شکار بنی رہتی ہے۔

انڈس کورٹ کے گراؤنڈ فلور پر گرو گرنتھ جی کا استھان ہے۔ بھولی سی شکل کا گدگدا سا پجاری میلی سی بنیان اور تہمد پہنے سیڑھیوں پر کھڑا جمائیاں لیا کرتا ہے۔ اس کی گدی پر نیبو کے برابر لٹکا ہوا بالوں کا جوڑا ہمیشہ تیل میں بھیگا رہتا ہے ویسے دن بھر نیچے راک اینڈ رول کے فلمی ریکارڈ بجا کرتے ہیں، لیکن شام کو خوب لوبان چلا کر بھجن گائے جاتے ہیں۔ مگر ان بھجنوں میں دل نہیں لگتا، اس لئے وہ عموماً فلمی دھنوں میں بھجن کی ٹیون بنا لیتا ہے اور رات گئے تک ڈھول پیٹا کرتا ہے اور جب گرو گرنتھ کے استھان سے "لال لال گال" اور "ریشمی شلوار" سنائی

دیتا ہے تو انسان خواہ مخواہ خدا کی ذات٭ بابرکات کا قائل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شان نرالی ہے۔ وہ چاہے تو پتھر پر پھول کھلا دے اور مندروں مسجدوں میں راک اینڈ رول بجوا دے!

یہاں پہلے مالے پر میرا گھر ہے۔

بیگم کا کردار

اگر بالکنی میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں اور نیک نیت٭ باندھ کر چالیس ڈگری کا زاویہ بنا کر دیکھیں تو آپ کو نیلوفر کا فلیٹ صاف نظر آئے گا۔ جی وہی سا، جو سب سے زیادہ بھڑک دار فلیٹ ہے، جس کے کمرے گہرے فیروزی اور گلابی رنگے ہوئے ہیں، جہاں نیون لائٹ کی روشنی میں پردے جھلملا رہے ہیں۔ جی وہی بلڈنگ، جس کے سامنے تگڑی تگڑی موٹریں ڈٹی ہوئی ہیں۔ یہ موٹریں یہاں سرِ شام ہی آ جاتی ہیں اور رت جگا منا کر صبح چلی جاتی ہیں۔ ان کے ڈرائیور قریب کی عمارتوں کی آیا لوگ کے ساتھ اور مالک سامنے کے جگمگاتے ہوئے فلیٹ میں دادِ عیش دیا کرتے ہیں۔ پاس ہی اسمگل کی ہوئی شراب کا اڈا ہے۔

وہ جو رس گلے جیسے بھرے بھرے جسم والی لچکدار حسینہ ہے۔ وہی اس فلیٹ کی اَن داتا ہے۔ اس فلیٹ تک لانے کے لئے ہی تو میں نے آپ کو اتنی زحمتیں دیں اور اتنی تفصیلیں بتائیں کہ کہیں آپ اس طرف نہ بھٹک جائیں جدھر راک اینڈ رول کی دھن میں بھجن گائے جا رہے ہیں۔ نیلوفر جب پیدا ہوئی تھی تو قرآن شریف میں دیکھ کر اس کا نام معصومہ بانو رکھا گیا تھا۔ تین بیٹوں پر بیٹی جو پیدا ہوئی تو جی بھر کے لاڈ و پیار ہوئے۔ خالہ جانی اور چھوٹے ماموں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے بیٹے کے لئے اُسے مانگنے پر اڑے ہوئے تھے۔ نیلوفر کی بیٹھ پر زبیدہ اور حلیمہ

معصومہ (نیلوفر)
زبیدہ
حلیمہ
سلیم

پیدا ہوئیں اور جب پیٹ کی کھرچن سب سے چھوٹا بچہ سال بھر کا تھا تو قیامت ٹوٹ پڑی۔

مملکت خداداد میں قاسم رضوی کی کمانڈ میں دلی کے قلعے پر جھنڈے گاڑنے کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ معصومہ عرف نیلوفر کے والد ماجد اس فوج کے رکنِ خاص تھے اور خطرے کی گھنٹی بجتے ہی اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ روپیہ پیسہ، قیمتی زیورات اور مکانوں کے کاغذات لے کر اڑ گئے۔

صرف گود کا بچہ سلیم اور تینوں لڑکیاں بیگم کے ساتھ رہ گئے۔ ارادہ تھا کہ وہاں پر جم جائیں گے تو سب کو بلا لیں گے۔

مگر نہ جانے کیا ہو گیا انھیں وہاں جا کر کہ لوٹ کر خبر ہی نہ لی۔ بڑے لڑکوں نے شادیاں کر لیں، بڑے بڑے عہدوں پر جم گئے۔ مکانات اور زمینیں بھی الاٹ کرالیں۔ تب کہیں جا کر ماں اور بہنیں یاد آئیں۔

اور تو اور بڑے میاں نے بھی ایک انیس برس کی بونڈیا سے بیاہ رچا لیا بیگم صاحبہ نہ بیٹوں کی شادیوں کی خبر پر ہنسیں نہ سوت آنے پر روئیں۔ جو کچھ میاں چھوڑ گئے تھے وہ کچھ دن کام آیا۔ پھر بچے کھچے زیور سے کام چلایا۔ کچھ دن ہاتھوں کی چوڑیاں چبائیں۔ پھر جگنو، چمپا کلی اور نو گھریاں نکلیں۔ پھر بازو بند اور بچوں کے زیور بھی پیٹ کی کھتی میں اتر گئے۔ کون تفصیل میں جائے؟ کچھ ہوا ہی ہو گا کہ وہ بستر بوریا سمیٹ کر بمبئی آ گئیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ بمبئی اس لئے آئیں کہ یہاں ہر مال کی اچھی قیمت ملتی ہے۔ بمبئی شہر دلوائے متوالوں کی بستی ہے۔ یہاں ہر شے کے قدرداں دل کھول کر

دام دیتے ہیں۔ چاہے وہ پرانی موٹریں یا اعلیٰ حضرت کی داشتاؤں کے زیورات ہوں، یا کامدار دوپٹے یا لچکدار پیٹیاں ہوں، نسبتاً دوسرے شہروں سے بمبئی میں مہنگے بکتے ہیں۔

پہلے تو آکر وہ ایک جان پہچان کے ہاں رہیں۔ ان کی بیوی نے جب ذات نکوسے تو انھوں نے از راہِ مہربانی دادر میں ایک کمرہ دلوا دیا بے چارے خود ہی کرایہ بھی دے دیا کرتے اور کچھ ادھار بھی۔ کام چلتا رہا۔ ان عنایتوں کے بدلے میں کبھی کچھ نہ مانگا۔ احسان بس سرِ شام سے آکر بیٹھ جاتے۔ بچوں کے ساتھ ہنس بول کر بارہ ایک بجے چلے جاتے۔ بیگم نے اصلی گھی کھایا تھا، پھر بھی اب بالوں میں کہیں کہیں چاندی جھلکنے لگی تھی۔ پہلے تو انھوں نے نکاح پر ضد کی، مگر جب آٹھ دن کے لئے مہربان دوست کسی ضروری کام کی وجہ سے نہ آسکے تو نویں دن ان کی صورت دیکھ کر بیگم کی نرگسی آنکھوں میں موتی جھلکنے لگے

دو سال اسی طرح گذر گئے۔ سلیم میاں کے اسکول کا خرچ اور لڑکیوں کی ضروریاتِ زندگی تنگی ترشی سے پوری ہوتی رہیں۔ تانبے کے کچھ برتن حیدرآباد میں پڑے تھے، بیگم کو انھیں بیچنے کی غرض سے جانا پڑا۔ ہفتہ بھر لگ گیا۔

واپس لوٹیں تو بچے جو ہو گئے ہوئے تھے۔ واپس لوٹے تو نہ جانے کیوں بیگم کو ایسا لگا معصومہ بہت جوان ہو گئی ہے۔ اس کی شادی کی فکر برچھی بن کر کلیجے میں اتر گئی۔ نہا کر معصومہ ایک پھول دار ہاؤس کوٹ پہنے تولیے سے بال پونچھتی نکلی تو انھیں بڑا تعجب ہوا۔ یہ نیا قیمتی تولیا، یہ پھولدار ہاؤس کوٹ۔۔ یہ تو شاید پہلے نہیں تھا!

اور پھر طوفان پھوٹ پڑا۔ ان کا بس چلتا تو معصومہ کا قیمہ کر کے کتّوں کو کھلا دیتیں، مگر اس نے قسمیں کھا کر یقین دلانا چاہا کہ احسان صاحب نے سیر کرائیں، پاؤڈر، لپ سٹک دلوائی، ڈریسنگ گاؤن لے کر دیا۔ اسکے علاوہ کچھ بات نہیں تھی۔ بیگم کے آنسو شاید کبھی کے جل گئے تھے۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہیں، آہیں بھرتی رہیں۔

دوسرے دن جب احسان صاحب آئے تو وہ ان کی جان کو جھاڑ کا کانٹا بن کر چمٹ گئیں۔

"بے کار پریشان ہو رہی ہو۔ میری بیٹیاں ہیں۔ اگر کچھ دلا بھی دیا تو کیا غضب ہو گیا؟ کیا آمنہ، فریدہ کو نہیں دلا دیتا؟"

"مگر معصومہ ہی آپ کی لاڈلی بیٹی ہے؟ زبیدہ اور حلیمہ سوتیلی ہیں؟ سلیم تو خیرات کا ہے! اسی کتیا کو ساری چیزیں دلا دیں۔"

"بھئی تم تو جان کو آجاتی ہو۔ اب تم سے بات کی جائے تو کیسے؟ دراصل وہ احمد بھائی میرے دوست ہیں نا۔ انھوں نے ۔۔ ان کا جنرل اسٹور ہے ۔۔ مانے ہی نہیں۔ سلیم میاں کو ہاکی اسٹک اور مکینو کا سیٹ پسند آیا۔"

"کون احمد بھائی؟"

"جنرل مرچنٹ۔ باندرہ میں رہتے ہیں لکھ پتی ہیں۔ ایک اسٹور مارکیٹ میں ہے ایک کلابہ میں۔ باندرہ میں فرنیچر کی دوکان ہے۔ بڑے آدمی ہیں۔"

بیگم سناٹے میں رہ گئیں۔

"اے ہے۔ مجھ سے کہا بھی نہیں۔ ہمت نہیں پڑتی تھی آپ سے کہنے کی۔

9 لڑکیوں کے والی آپ ہی ہیں ۔ ان کا انتظام ہو جائے تو ۔ مگر میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ۔"

"ہاں ہاں ۔ اس کی فکر نہ کرو ۔" وہ کچھ خجل سے ہو گئے ۔ "فلیٹ ابھی خریدا ہے انھوں نے دادر میں ۔ اونر شپ پر ۔"

بیگم کے دل سے دعاؤں کے جمگھٹ نکل پڑے ۔ بچے سو گئے ۔ وہ احسان صاحب کے پاس بیٹھی گلوریاں بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے منہ میں دیتی رہیں ۔

"انھیں لائیے نا ایک دن ۔"

"تمہارے پیچھے تو کئی دفعہ آئے ۔ ابھی میں نے سوچا یہ موقع ہاتھ سے نہ جائے تو اچھا ہے ۔"

"خیر آپ گھر کے مالک ہیں ۔ مگر کل انھیں کھانے پر بلائیے ۔"

احمد بھائی سورت والا دوسرے دن آئے ۔ کوئی پینتالیس برس کے پاجامہ، کنٹھی اچکن، رومی ٹوپی پہنے ۔ انھیں دیکھ کر بیگم دھک سے رہ گئیں کر سوچا:

"بجائے مہندی کے اللہ کا بندہ خضاب لگائے تو اتنا بھونڈا نہ لگے ۔"

احمد بھائی ایک نیکلس لائے تھے، جو انھوں نے معصومہ کو دے دیا ۔

"ادل ۔ ہم نہیں لینے ۔" معصومہ ٹھنکنے لگی ۔

"کیوں جی ؟" احمد بھائی پان بھرے* دانت نکوس کر بولے ۔

"کیوں لیں ؟ ہمیں اچھا نہیں لگتا ۔"

"نہیں اچھا لگتا تو دوسرا لائے گا بابا ۔"

"ہم دوسرا بھی نہیں لیں گے۔" معصومہ کھلکھلا کر ہنسی اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ احمد بھائی اس ادا پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"آج چھوکری کو جو ہو لے جاوے؟ جرانم بولو نا۔" انھوں نے ٹھنک کر احسان بھائی کے کان میں کہا۔

"اماں ذرا نگاہیں ڈاب کے۔ ہاں! ورنہ سارا معاملہ چوپٹ ہو جائیگا۔"

"سالا پیسہ جاستی مانگتا تو کوئی واندہ نہیں۔ ہم دے گا بابا۔" احمد بھائی بلبلائے۔

"اے یار پیسہ کی بات نہیں۔ اونچے گھرانے کی لونڈیا ہے سولہ برس لگا ہے۔ کسی نے آج تک اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا۔ اتنی اتاولی نہیں چلے گی جلدی کام شیطان کا۔" احسان نے سمجھایا۔

مگر جب بیگم کو احسان میاں کی دلالی کا پتہ چلا تو انکی سوکھی آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے:

"صورت تو دیکھو جھڑ دس کی۔ میری نازک بچی کو بس یہ کیڑ دق بھرا کباب ہی رہ گیا ہے؟ کل کی لونڈیا سے شادی کر کے داڑھی کو کالک لگوائیگا"

مگر بڑی میٹھی آواز میں احسان میاں نے سمجھایا کہ احمد بھائی ایسے کمینے نہیں جو نکاح کرنے کی گستاخی کریں۔ نکاح تو وہ کر بھی نہیں سکتے۔ انکے سسر بارسوخ آدمی ہیں چندیا پر ایک بال بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

پھر تو بیگم شتابہ بن گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں برسنے لگیں۔ انھوں نے اتنا تکلف کیا کہ احسان میاں کو نکالتے وقت جوتے نہیں لگوائے۔

احمد بھائی کی آنکھوں میں آنسو تھے!

"تم ہم کو اُلو کا پٹھا سمجھتا ہے سالہ ۔ پہلے بولا چھوکری ملتا، پھر بولا نہیں ملتا ۔ یہ کیا لفڑا ہے؟"

"دھیرج کا کام ہے سیٹھ ۔ پکا پھل کتنے دن ڈال پر اٹکا رہے گا؟ تم ہم پر بھروسہ رکھو ۔ اونچا مال فٹ پاتھ پر نہیں ملتا ۔ صبر تو کرو کچھ دن ۔"

"اچھا بابا ۔ صبر کرے گا ۔ پن کتنا روج؟" احمد بھائی عاشق صادق کی طرح آہ بھر کر بولے ۔

"ریٹا کے بال بچہ ہونے والا ہے سیٹھ ۔ وہ سالی دنگا مچائے گی ۔ پہلے اس کا معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جانے دو ۔"

"تم کیا بات کرتا؟ سالی ریٹا کا ہم اکھا کھرچ دیتا ہے اور پھر بھی دیگا ۔ تمہارے کو اس کا کیا ورّی کرنے لگا ۔ کوچھ لفرا نہیں کرے گا ۔ ہم پیر بھائی سے بات بھی کیا ۔ وہ سالہ فلیٹ کا ایڈوانس بھی لے لیا ہم نے ۔"

"شانتا کروز والا فلیٹ آپ بیچ رہے ہیں؟"

"نہیں بیچے تو کیا کرے؟ اپنا فادر اِن لا بوت بوما بوم کرتا ۔ سالہ چھوکری ایک دم بدمعاش!"

"کون سی چھوکری؟" احمد بھائی کی بات سمجھنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ۔

اصلی بات یہ تھی کہ ریٹا سے ان کا دل بھر چکا تھا ۔ بڑی کھٹ کھٹ کرتی ہے! بہت دن سے سیٹھ کو شکایت تھی کہ ان کی سگی بیوی اتنی سونیا ڈاہ میں نہیں جلتی جتنی ریٹا سلگتی تھی ۔ اس نے ان کے پیچھے جاسوس

لگا رکھے تھے۔ پیر بھائی عرصے سے اس کے مدّاحوں میں سے تھے۔ ان سے مراسم بڑھے اور احمد بھائی نے بڑی خوشی سے مکان کے جملہ سامان کے ساتھ ریٹا کو انہیں تھما دیا۔ اب اس کے بچّہ ہونے والا تھا، جس کا الزام دونوں اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے تھے۔ ریٹا کا ایک دوست آیا کرتا تھا جسے وہ اپنا بھائی بتاتی تھی، مگر بعد میں معلوم ہوا وہ کسی زمانہ میں اس کا فیانسے تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا اسی نے ریٹا کا ناس مارا تھا۔ چھ سال تک غائب رہا۔ اب واپس لوٹا تو پھر چالو ہو گیا۔ ہونے والا بچّہ اصل میں اسی کا تھا۔ احمد بھائی ادھر کئی ماہ سے اس سے ملے ہی نہیں تھے۔ ایک دم اس سے جی اوب گیا۔ صورت دیکھ کر بخار سا چڑھنے لگا تھا۔ پیر بھائی بالکل دیمک زدہ معلوم ہوتے تھے مگر اپنی جائیداد کے خود مالک تھے۔ بیوی مر چکی تھی۔ وہ تو شادی کرنے کو بھی تیار تھے مگر ریٹا ہی ٹال گئی۔ شادی ہو گئی تو بے چارے پیر بھائی کو دوسری کوئی رکھنا پڑے گی۔

"پھر بھی سیٹھ ایسی لڑکی آسانی سے نہیں ملا کرتی ہے۔ میرے اوپر بھروسہ رکھو۔ میں نے کڑیاں کسنی شروع کر دی ہیں، بس کوئی دم میں تمہارا کام بن جائیگا،" مگر احمد بھائی کبیدہ خاطر ہی رہے۔

"سالہ روپ چند کو کتنا چھوکری سے انٹروڈیوس کراتا ہے لال جی اس کا اسسٹنٹ فلم والا۔ یہ سالہ سوشل فلم والا ایک دم کنڈم ہوتا ہے۔ ہم کو روپ چند بولا: 'ہمارے ساتھ آجاؤ۔' وہ لوگ کھنڈالا جانا لوکیشن دیکھنے کو۔ اکھا چھوکری بیکری لے کر۔ ہم کو دو کیس بیئر اور وہسکی کو بولا۔

ہم بولا بھائی کا جو ملے گا۔ وہ سکی اگلے ہفتے دے گا۔ کیا دبا دم چھوکری ہے سالا۔" احمد بھائی نے لڑکیاں اور بوتلیں الجھا دیں۔

"روپ چند ایک چور ہے۔ لال جی سر پیٹ رہا تھا کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ ہنڈی پہ ہنڈی لکھاتا جا رہا ہے، پیسہ نکالتا نہیں۔ سات دن سے سیٹ کھڑا ہے۔ اور سائیڈ ہیروئن غائب! بولو تو کہتا ہے دوسری لے لو۔ اب بھلا بتائیے بیچ پکچر سے دوسری لے لو۔"

"دوسری تو لینا ہی پڑیگا۔ ہیں ہیں ہیں۔" احمد بھائی ہنسے۔ سائیڈ ہیروئن روپ چند سے بہت جلدی بیاہ کرنے والی تھی۔ مگر احسان بھائی کو معلوم تھا روپ چند دوسری شادی نہیں کر سکتا۔

احمد بھائی کو سمجھا بجھا کر احسان صاحب نے کڑیاں کسنے کا نیا پروگرام بنایا اور اس پر شدت سے عمل درآمد کرنے لگے۔

بیگم کمر کمر دلدل میں پھنسی ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ہلکی سی جنبش بھی انھیں اور نیچے کھینچ رہی تھی۔ اژدہے کا دہانہ چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔ چھ سات مہینے کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ باورچی روز غراتا۔ کمبخت نمک کی ڈلی میں سے بھی اپنا حصہ نکال لیتا تھا۔ گوشت لاتا جیسے چھیچھڑے، کوڑے پر سے ترکاری اٹھا لاتا۔ اور ان سے پورے دام لیتا۔ مارکیٹ میں سڑی گلی ترکاری کے ڈھیر کا لوگ ٹھیکا لے لیتے۔ یہ ترکاری ٹوکروں میں بھر کر ہوٹلوں وغیرہ میں پہنچا دی جاتی ہے یا غریب لوگ اونے پونے خرید لیتے ہیں۔ اس میں بعض وقت اچھے خاصے ترکاری کے ٹکڑے بھی مل جاتے ہیں۔ بیگم جانتی تھیں کہ

باورچی اپنی تنخواہ کے پیسے تو نکال ہی لیتا ہے، پھر بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ احسان صاحب ہی سے کچھ دبتا تھا۔ اب احسان صاحب بھی کچھ چپ چپ سے نظر آرہے تھے اس لیے وہ شیر ہوتا جارہا تھا۔ لڑکیوں نے بھی دوچار بار شکایت کی کہ وہ وقت بے وقت انھیں تاکا کرتا ہے۔ دروازوں کے شیشوں پر سفید وارنش کی ہوئی تھی، وہ دو ایک جگہ سے کسی نے کھرچ کر باقاعدہ ایک آنکھ کے جھانکنے کا انتظام کرلیا تھا، اور عموماً جب لڑکیاں کپڑے بدلتی ہوتیں تو ان کھرچے ہوئے حصّوں میں کالو نخ بھر جایا کرتی تھیں۔

بچوں کی فیس نہیں گئی تھیں اور نام کٹنے کی دھمکیاں آرہی تھیں۔ ڈاکٹر کا بل تو سال بھر کا چڑھ گیا تھا۔ احسان صاحب نے انھیں کے لیے کھاتا کھلوا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ بل بڑھتا رہا، خبر ہی نہ ہوئی۔ دودھ والے نے تو کھرے کھرے پیسے رکھوالیے۔ احسان صاحب بہت چیں بہ جبیں ہوئے:

"میرے پاس قارون کا خزانہ تو نہیں۔ میں بھی بال بچّوں والا آدمی ہوں۔"

انھوں نے بڑے مجبور لہجہ میں کہا۔

مگر بیگم کی کمان نہ جھکی۔ انھیں دنوں کسی نے رائے دی تھی کہ لڑکیوں کو فلم میں ڈالو، بڑی کامیاب رہیں گی۔ اس زمانے میں شیواجی پارک اور دادر میں کئی پروڈیوسر رہتے تھے۔ باری باری وہ سب ہی سے ملیں۔ رنجیت اسٹوڈیو کی خاک چھانی۔ ایک دوست کے ساتھ مجھ سے بھی ملنے آئیں۔ مگر ہماری فلم کی کاسٹنگ ہوچکی تھی۔ دوسرے اس وقت جس انداز سے انھوں نے اپنی عالی نسبی کی ڈینگیں ماریں، اس سے جی جل اٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا وہ معصومہ بانو کو فلمی دنیا میں لاکر فلم لائن پر ہی نہیں میری سات پشتوں پر احسان کر رہی ہیں۔ دوسرے وہ سمجھتی تھیں کہ بس فوراً ہی کانٹرکٹ ہو جائیگا اور پیشگی مل جائے گی۔ مگر ہفتہ بھر تک تو پروڈیوسر سے ملنے کی نوبت نہ آئی۔ روز جاکر اسٹوڈیو میں بیٹھی سوکھا کرتیں، ملاقات تو درکنار، کوئی نظر اٹھاکر بھی نہ دیکھتا۔ بھیڑ جھاڑ جھلے کپڑے پہنے، شرمائی لجائی معصومہ کو کون غور سے دیکھتا! بیگم کے تیہے نے اور کام بگاڑ دیا۔ وہ ہر شخص پر اپنا بیگماتی رعب جمانا شروع کر دیتیں۔ اناڑی نایکہ بھلا کیا معصومہ جیسی الہڑ لڑکی کو بنا پاتی۔ انجام کار قرض بڑھتا گیا۔ احسان بالکل روٹھ گئے۔ مکان والے نے دانت نکوس نکوس کر تقاضے شروع کر دیے۔ بچوں کے نام اسکول سے کٹ گئے۔ پیدل اسٹوڈیو کی خاک لیتے لیتے جوتے گھس گئے۔ کسی نے غور سے معصومہ کو دیکھا تک نہیں مگر جس چیز نے بیگم کی کمر توڑ دی وہ شوہر کے بیاہ کی خبر تھی۔ بڑے میاں نے ایک انیس برس کی کومل سی لونڈیا سے نکاح پڑھوالیا اور بیگم کو دفت ضرورت طلاق دینے کا پکا وعدہ کر لیا۔

اس دن پہلے تو وہ کمرہ بند کر کے روتی رہیں، پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، چوٹی کی اور خانساماں کو احسان صاحب کے پاس بھیجا۔ خانساماں کچھ اکڑفوں دکھانے لگا تو انھوں نے وہ زور کی ڈانٹ بتائی کہ بھاگا بے چارہ۔ اسے کیا معلوم چند گھنٹوں میں بیگم کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہیں!

احسان آئے تو بیگم ماتھے پر کہنی کا چھجہ بنائے لیٹی تھیں۔

" اللہ کیا دماغ ہو گئے ہیں حضت — بلاوے بھیجنے پڑتے ہیں۔ میں تو اب

انوٹیشن کارڈ چھپوا رکھوں گی۔ وقت بے وقت بھیجنا پڑ جائے تو۔"

احسان صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری اور وہیں قدموں پر ڈھیر ہو گئے۔

اس دن بیگم کی خاندانی جھجک نے دم توڑ دیا۔ انھوں نے حامی بھر لی فلیٹ بچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔ لڑکی بغیر ان کی مرضی سے رات کو باہر نہیں رہے گی۔ شاید اس طرح انھوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لیا ادھر وہ کسی کی انیس برس کی کونپل کو کھرل کر رہے تھے ادھر ان کی اسی عمر کی بیٹی کے دام لگ رہے تھے۔ بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحبزادی نے دھندا شروع کر لیا تو مزہ آجائے گا۔

"آج؟ نہیں نہیں۔ مہلت چاہیے۔" وہ احسان کی تجویز پر بھڑکیں۔

"تمہاری مہلت نے تو میرا اکھنہ کر دیا۔" وہ جھلا کر بولے۔ "حرام زادہ سائننگ منی تک دینے کو تیار نہیں۔ کہتا ہے میرا کچھ انفلوینس ہی نہیں۔ ایسے آدمی کا کیا بھروسہ؟"

جب ڈاکٹر زخم چھیڑنے کے لیے نشتر بڑھاتا ہے تو مریض گڑگڑا کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے: "ذرا ٹھہر جاییے۔ بس ذرا۔"

مگر آپریشن تو ہونا ہی ہے۔ ڈاکٹر کتنے دن ذرا ٹھہر سکتا ہے؟

"لڑکی کی طبیعت ذرا اکسلمنڈ ہے۔" انھوں نے احمد بھائی کو بہلایا۔

"ارے منا دو سالی کو۔ ہم آج پونا جاتا ہے۔"

"پھر کب لوٹیں گے؟"

"ریس کا سیزن ادھر ہی رہے گا۔ ہم سوچتا ہے ادھر نو یگ اسٹوڈیو ملتا ہے"

سولے لیوے۔"

"ارے ہٹاؤ بھی۔ نویگ میں کیا دھرا ہے؟ کوڑا پھنکوانے میں ہی آدھا پیسہ اڑ جائے گا۔ اور وہ سالی مسز مخیل آپ کو اُلّو بنا رہی ہے۔ گھنا* ہوا مال ہے۔ قطامہ کے پاس۔ گھسی پٹی گوڑوں کی جھوٹن انگلو انڈین چھوکریاں۔ اور پھر سیٹھ ساٹھے کا مال تمہیں ہضم نہیں ہوگا۔"

احمد بھائی آبائی ڈرپوک تھے، کچھ سہم گئے۔

"ایسی بھی کیا اتاولی ہے سیٹھ؟ سینچر کو چھوکری چالو ہو جائے گی۔" آنکھ ماری۔

"مخول کرتا ہے۔" احمد بھائی مسکرائے۔

"تمہارے سر کی قسم۔ اچھا چلو مجھے سامان تو دلوا دو۔ سیٹ کل تک کھڑا ہو جائے گا۔"

یہ سیٹھ سمجھتے ہیں عقل کا ٹھیکہ بس انھیں کے پاس ہے، ہر شے پر نگاہ رکھیں گے، ہر سامان خود جا کر اپنی آنکھوں کے سامنے خریدیں گے تاکہ پروڈیوسر ٹھگ نہ لے مگر پروڈیوسر بھی ایک گھاگ ہوتے ہیں؛ ویسے تو کہہ دیتے ہیں کہ جب تک فلم کی بزنس نہیں ہو جاتی وہ خود کوڑی نہیں لیں گے، بس پروڈکشن پر جو خرچ ہوگا وہی فنانسر کو دینا پڑے گا۔

سیٹ کے لئے بیس ہزار کی لکڑی آنی تھی۔ پہلے تو احمد بھائی نے خود اپنے آپ کو ٹھگا یعنی پندرہ ہزار کی لکڑی خریدی اور رسید بیس ہزار کی بنوائی۔ اب وہ پندرہ ہزار کی لکڑی جب احسان صاحب وصول کرنے گئے تو انھوں نے دس ہزار

کی لکڑی لدوائی، باقی پانچ ہزار کی لکڑی چار ہزار میں واپس کر دی۔ ایک ہزار دوکاندار کو بیچے۔ یہ لکڑی اسٹوڈیو لائی گئی۔ اب معلوم کیا گیا کہ کس کس کو لکڑی چاہیے۔ چپکے چپکے وہ دس ہزار کی لکڑی اِدھر اُدھر بارہ ہزار میں کھپا دی گئی۔ سیٹھ کے لئے تھوڑی سی رکھ لی گئی۔ احمد بھائی چیک کرنے آئے تو جس کا بھی کام چالو ہوا، وہی دکھا دیا۔ مستری نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

یہی کاسٹیوم کے معاملے میں ہوا کرتا ہے۔ یار دوستوں سے کپڑوں کے کیش میمو جمع کر لیے اور دکھا دیے سیٹھ کو۔ یہی پھر انکم ٹیکس میں کام آئیں گے۔ ویسے سیٹھ زیادہ چالاک ہو تو دوکاندار سے معاملہ فٹ کرنا پڑتا ہے۔ تین ہزار کے کپڑے کا بل وہ چار ہزار بنا دے گا۔ پانچ سو اس کے اور پانچ سو آپ کے۔ بعض سیٹھ بڑا چالاک ہوتا ہے، وہ اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ سارا کپڑا اس کے چاچا کی دکان سے خریدا جائے اور ماما کی دکان سے سلوایا جائے، تاکہ بے ایمانی کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اب اگر سیٹھ پھنس چکا ہے اور اس کا روپیہ لگ گیا ہے تو بس ہر کپڑے کو کیمرہ مین سے مل کر رد کروا دیجیے:

"نہیں صاحب یہ نہیں چلے گا۔ چالی ہو جائے گا۔" کیمرہ مین کہہ دے تو سیٹھ بے بس ہو جائے گا۔ حالانکہ چالیس فیصدی سود لے رہا ہے پھر بھی سیٹھ چاہتا ہے جتنا پیسہ دیا جائے وہی اس کا منافع ہے۔ وہ اس فلم کی گردن میں ہر خرچ باندھنا چاہتا ہے: اپنے نوکروں کی تنخواہیں، بال بچوں کا خرچہ، گھر میں آفس کے بہانے کرایا۔ سیر و تفریح کا سارا خرچ، اپنی داشتاؤں کے لاڈ پیار کا خرچ۔

۔ اِدھر پروڈیوسر بھی اسی چکر میں ہے کہ جو ہاتھ آ جائے پھر کون دیتا ہے؟
ڈسٹری بیوٹر تو سوائے ہٹ کے کسی فلم میں منافع نہیں دکھاتا۔ ظاہر ہے جب
ایک فلم پر اتنے گدھ منڈلا رہے ہوں تو وہ کس قسم کی بنے گی۔ ریلیز ہو کر پہلے
ہفتے میں ٹھپ ہو جائے گی، ساتھ ساتھ پروڈیوسر اور فنانسر بھی ٹھپ۔

بڑی مشکل سے گھنٹوں سر کھپانے کے بعد احمد بھائی کو شیشے میں اتار
لیا گیا۔ طے ہوا کہ اِدھر وہ دو گانے ریکارڈ کروائیں اُدھر معصومہ اُن کی۔
یہ دونوں گانے کریڈٹ پر ریکارڈ ہو رہے تھے۔ آشا بھونسلے کے
ہاتھ پیر جوڑے تو وہ اس شرط پر تیار ہو گئی کہ بمبئی کی ٹیری ٹری سے ادائگی
ہو جائے گی۔ اسٹوڈیو اور خام مال تیس فیصدی سود پر ملا ہی ہوا تھا۔
میوزیشن بھی کریڈٹ دینے پر تیار ہو گئے۔ لیجئے گانے ریکارڈ ہو گئے۔

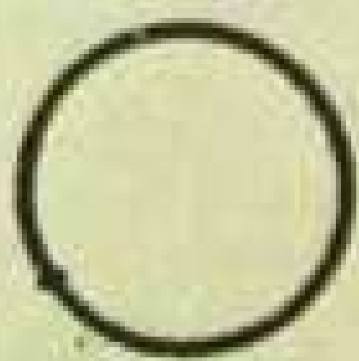
بیگم ساری رات بالکنی میں ٹہلتی رہیں۔ حامی تو بھر لی، مگر ہوگا کیسے؟
براہِ راست معصومہ سے دھڑ سے کہہ دیں؟ منہ نہیں پڑتا۔ کئی بار چاہا اسے
بلا کر سینے سے لگائیں اور سمجھائیں۔ مگر کیا سمجھائیں؟ ساری عمر تو یہی تلقین
کی: "بیٹی! عورت کا زیور اس کی عزّت ہے۔ جان جائے پر عصمت پر بال
نہ پڑے۔" آج اس سے کیوں کر کہیں کہ اب تیرے سوا زندگی کا کوئی سہارا
نہیں؟ تجھے قربانی دینی ہو گی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگانے
کے لئے پتوار بنا ہو گا۔

نہیں، یہ ان سے نہ ہو گا۔ روتے روتے صبح ہو گئی۔ دور کرشنا مل
کا پھاٹک کھل رہا تھا اور رات پالی کے مزدور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے

بھوک کی طرح مرے قدموں سے نکل رہے تھے۔ تازہ دم بوڑھے، جوان، لانگ کسے اور عورتوں کے ہنستے ہوئے غول پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے صبح کی سفید روشنی میں سیاہ سڑک پر پڑے ہوئے چاٹ کے کاغذ ادریتے کوڑھ کے داغوں کی طرح ابھر رہے تھے۔ ایک چھلا ہوا کسیرہ جیسا کتا کھمبے پر ٹانگ اٹھا کر موت رہا تھا۔

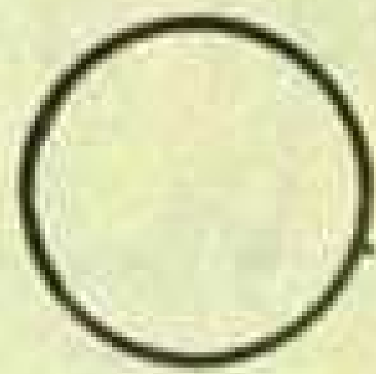
وہ پلٹ کر کمرے میں آگئیں۔ معصومہ پر بے اختیار نظریں جم گئیں: کیا بے سدھ میٹھی نیند میں غرق تھی۔ الجھے ہوئے بالوں سے آدھا منہ ڈھکا تھا۔ گلابی ہونٹوں کے درمیان آگے کے دو دانت چمک رہے تھے۔ قمیص کا کھیسہ سلوٹلے دب کر گلا کھینچ رہا تھا۔ جھک کر انھوں نے اس کے گریباں کے بٹن کھول دیے۔ ایک دو تین۔ سفید سفید بھولا بھولا کنوارا سینہ نہ جانے کن پیار بھرے سپنوں کی دھڑکن سے لرز رہا تھا!

وہ پٹی سے لگ کر کھڑی دھاروں دھار روتی رہیں۔ بمبئی کا جلد باز سورج کھڑکی سے جھانکا۔ کھڑکی میں پڑا ہوا چیتھڑا اہلا اور جیسے دودھ پہ کھٹیالہ سانپ لہرانے لگا۔ سہم کر انھوں نے بچی کو چادر سے ڈھک دیا۔



دوسرا باب





کیا دھوم دھام تھی۔ تین بیٹوں پر بیٹی ہوئی تھی ۔ نازک سی۔ پیٹ میں تھی تب ہی اندازہ ہو گیا تھا، کیونکہ پیٹ بیٹوں کے دفعہ چھاتی تک چڑھ آتا تھا ۔ معصومہ نازک چڑیا سی پیٹ میں معلوم بھی تو نہ ہوتی تھی۔ ذرا سا دودھ پی کر پیٹ بھر جاتا تھا۔ ہوا بھی الغاروں دودھ تھا۔ جو ماں کے دودھ زیادہ اترے تو کہتے ہیں بچہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ روپے کی افراط رہتی ہے۔ نجومی نے پیشانی دیکھ کر کہا تھا: بڑی طالع ور بچی ہے۔ بڑی برکت لائے گی۔ دروازے پر ہاتھی جھومے گا۔ ہاتھی! احمد بھائی تو بالکل خچر تھے!

تیرھویں برس سے پھول؟ پہنے، تبھی سے پیغام پڑنے لگے۔ بڑے بڑے نوابوں کے پیغام ۔ "اُنہہ، یہ نواب بڑے نکھٹو ہوتے ہیں۔ کسی آئی۔ سی۔ ایس سے کریں گے اس کا بیاہ۔" مبارک تو ثابت ہوئی نگوڑی: اسی مہینے ترقی ہوئی سال بھر کی تھی تو خطاب مل گیا۔ فوج کی کمان مل گئی۔ حضور سرکار کی عنایات کی بخشش ہونے لگی۔

نو دن پہلے نوبت رکھواؤں گی۔ بالکل پرانی شان سے شادی ہو گی۔ نو دن مانجھے بٹھائی جائے گی۔ دلّی کلاکاٹن مشہور ہے۔ مہندی گھر کی جھاڑی

سے نکلے گی۔ دادا ابا نے پوتی کے سہاگ کے لئے قلم لگائی تھی۔ اب تو سارے برآمدے کے نیچے پھیل گئی تھی۔ عید بقر عید کو لڑکیاں بالیاں مہندی سونتنے لگتیں تو جی ڈرتا تھا کہ مردیاں کہیں جڑ نہ ہلا دیں۔ بڑوں کے ہاتھ کی لگائی ہوئی مہندی سے، شادی تک رہ جائے تو جانو۔

مگر پولیس ایکشن کے زمانے میں جب تن بدن کی سدھ نہ رہی تو سارے ہی پیڑ سوکھ گئے۔ کوٹھی تین مہینے ڈھنڈار* پڑی رہی۔ جڑوں میں دیمک لگ گئی۔ جب پرانا سامان نکالنے گئیں تو جہاں مہندی لہرایا کرتی تھی ادھر غسل خانہ کی بو ٹہر رہی تھی۔ مہندی کا سوکھا جھاڑ کوڑے پر پڑا تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی پتیاں* جھم جھم بکھر گئیں۔ جی دھک سے ہو گیا۔ ایسی ارمانوں کی مہندی جل جائے، یہ کوئی اچھا شگن نہیں۔ شادی میں برات کو سات کھانے دینے کا ارادہ تھا۔ پلاؤ، قورمہ، تندوری، مرغ، شکم پور، شاہی ٹکڑے، سیخ کباب۔ اور۔ اور۔ انھیں کھانوں کے گرم گرم بھبکے آنے لگے۔ شام کو سب نے مسکہ* پاؤ کے ساتھ چائے پی لی تھی۔ ماں کی پکی وصولی سے پہلے احسان صاحب کوڑی کا اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو ایرانی ریستوران کا مالک اب تک مہربان تھا۔ قرض مع سود ایک دن وصول ہو جائے گا۔ جب کسی پیڑ میں پکے پکے پھل جھول رہے ہوں تو پاس پڑوس والے لوٹا بھر پانی سے اس کی جڑ سینچ دینے میں تکلف* نہیں کرتے!

بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی؟ آخری دن بھی آ ہی گیا۔ اسکیم کے مطابق سلیم اور دونوں لڑکیوں کو سرِ شام ہی سے احسان صاحب کے ہاں

بھیج دیا تھا جہاں احسان صاحب کی رائے کے مطابق ان کی بیٹیوں نے رات کو انھیں روک لیا۔ معصومہ بھی جانے کو ضد کرنے لگی، مگر بیگم نے جل کر اسے ڈانٹ دیا، سارا واقعہ ایک اتفاق معلوم ہوا اسلیے معصومہ سے اچھے کپڑے پہننے کو بھی نہ کہا۔ ویسے قاعدے سے لوگ قربانی کے بکرے کو بھی ہار پھول پہناتے ہیں۔ شام کو جب احسان، احمد بھائی کے ساتھ داخل ہوئے تو بیگم کو پسینے چھوٹ گئے، جیسے بیٹی کے بجائے خود ان کی عزت پرشہ پڑ رہی ہو۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی رہی:

"انڈسٹری کا بھٹہ گل ہو رہا ہے۔ ایک پروڈیوسر کو ایکسٹرا آرٹسٹوں نے مارتے مارتے چھوڑا۔ کاسٹیوم انچارج نے کپڑے چرا کر بیچ دیے۔ اس کا سال بھر کا پیسہ مار لیا تھا۔ اب تو سوائے ہیرو ہیروئن کے یا انکے چیلے چپاٹوں کے کسی کی دال فلم لائن میں نہیں گلتی۔ اب تو ڈسٹری بیوشن بھی یہی لوگ سنبھالنے جا رہے ہیں۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا جب سینما ہال بھی یہی خرید لیں گے۔"

"پھر ہال میں فلم بھی یہی لوگ دیکھیں گے۔" بیگم نے بات میں بات جوڑی

"ہاں صاحب یہی ہوگا۔"

مگر احمد بھائی آمدم برسرِ مطلب کے منتظر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ انھیں اس ٹال مٹول سے جھلاہٹ چڑھ رہی تھی۔ خوب پیے ہوئے تھے، اس پر بھی بار بار جیب سے فلاسک نکال کر، پیٹھ موڑ کر، چسکی لگائے جا رہے تھے۔ معصومہ "ٹرو اسٹوری" کا ایک پرانا پرچہ لیے دھندلے بلب کی روشنی میں اوندھی پڑی تھی۔ کبھی گدی کھجاتے، کبھی مونچھیں ٹٹولتے، کبھی رانوں میں سلسلاہٹ

ہونے لگتی۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔ بیگم ایک ایک سیکنڈ ٹال رہی تھیں، جیسے ڈاکٹر کا نشتر ان پلوں میں کُند ہی تو ہو جائے گا، یا کہیں آسمان سے انکے سارے دکھوں کی دوا ٹپکنے لگے گی۔ مگر کب تک؟ احمد بھائی زور زور سے احسان صاحب کی پسلیوں میں کہنیاں مار رہے تھے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھیں۔ ایک بار جی چاہا اس کے منھ پر تھوک دیں: "حرام زادے تیری بھی تو کنواری بیٹیاں ہیں، جا ان پر ایک نظر ڈال آ۔ وہ جن کے جہیز کے لیے تو نے الماریاں بھر رکھی ہیں۔ کیا یہ روپیہ انھیں الماریوں میں سے نکال کر میری معصومہ کو خریدنے آیا ہے؟ جیسے وہ بھی آٹے کی بوری ہے، یا گھی کا کنستر ہے۔" مگر پانی سر سے گذر چکا تھا۔ ڈوبتے ڈوبتے ابھر کر انھوں نے کہدیا:

"میں ابھی آئی — ذرا لکشمی بائی سے تھوڑے سے پاپڑ لے آؤں۔" باورچی کو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ معصومہ کو شبہ بھی نہ ہوا اور وہ چلی گئیں۔

"بھئی میری ریکارڈنگ کی ڈیٹ ہے، کوئی گھنٹہ بھر سے آجاؤں گا۔" انھوں نے معصومہ کو سنانے کے لیے اونچی آواز سے کہا، "احمد بھائی تم بیٹھو۔ لڑکی اکیلی ہے۔ بیگم آجائیں تو تم بھی آجانا۔ ذرا ڈانس کا گانا سننا۔ کیا شمشاد نے گایا ہے قسم سے۔ نوشاد کی ٹیون کچھ بھی نہیں اس کے آگے۔ بڑی دھانسو ٹیون ہے۔ تھیم سونگ ہے۔ جب ہیرو موٹر کار سے زخمی ہو جاتا ہے تو یہی ٹیون سیڈ ہو جاتی ہے۔ پھر ڈریم سونگ میں اسی ٹیون کو والز میں بنوا رہا ہوں' دو گانے کے لیے۔ پھر کمال دیکھیے یہی ٹیون جب ہیروئن کے بچّے کو بخار آجاتا ہے تو لوری کی طرح ..."

"ہاں ہاں جانتا ہے بابا۔ جاؤ نا! اب یہ نایک کو کھوٹی کرتا ہے۔" احمد بھائی

بے قرار ہو کر بولے۔

"اچھا اچھا۔" احسان بھائی پر اوس پڑ گئی۔ وہ بھی چلے گئے۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے گھر میں کوئی نہیں۔ پورے محلے میں کوئی نہیں۔ بمبئی میں کوئی نہیں۔ دنیا میں کوئی نہیں! صرف دھندلے پنکھوں کے گُوں میں سِنے ہوئے بلب کی روشنی میں جھکی ہوئی بے خبر معصومہ اور خلش زدہ احمد بھائی۔

دور کہیں کسی زخمی پلے کے کسی نے ٹھوکر ماری اور وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا گٹر میں گھس گیا۔ بیگم سر جھکائے تیز تیز بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھیں۔ انکی آنکھوں سے آنسو ابل۔ راستہ انجان بنا رہے تھے۔ کسی نے اندھیرے میں انکے آنسو نہ دیکھے۔

بس سے اتر کر بیگم دیر تک دادر کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر چیٹ پٹ خریدتی رہیں۔ پھر خداداد سرکل کے دو چار چکر لگائے۔ سوچا: براڈوے سینما میں شو ہی دیکھ ڈالیں۔ مگر ایک دم ایسی وحشت ہوئی کہ پھر لوٹ پڑیں۔ شیواجی پارک میں لاتعداد جوڑے ٹہل رہے تھے — سامنے کیڈل کورٹ کے آگے کچھ غنڈے ڈھول کی تھاپ پر پواڑا گا رہے تھے۔ وہ سیدھی سمندر کی ریت پر نکلی چلی گئیں۔ ٹھنڈی ریت پر بیٹھ کر نہ جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

سامنے سمندر سسکیاں بھر رہا تھا۔ پانی دھیرے دھیرے لوٹ رہا تھا۔ وہ روتی رہیں۔ آس پاس لوگ ہولے ہولے باتیں کرتے ٹہل رہے تھے۔ کبھی کوئی روپہلا قہقہہ فضا میں جھنک کر کسی بھاری آواز میں ڈوب جاتا۔ انھوں نے دونوں مٹھیوں میں ریت بھینچ کر چیخوں کو گھونٹ دیا۔

وہ کتنی اکیلی تھیں؟ دنیا میں کسی کو بھی احساس نہ تھا کہ وہ اکیلی ہیں۔ دنیا ان کو بھول چکی تھی۔ نواب صاحب نے کن ارمانوں سے ہاتھ پیر جوڑ کر ابّا سے انھیں مانگا تھا۔ کبھی دکھی بات نہ کی سچ مچ پھولوں میں تول کر رکھا۔ کیا گرما گرم پیار تھا! کتنی حسین جوانی تھی! میٹھی میٹھی نیند آنکھوں میں کھٹک رہی ہے اور رتجگے چلے جاتے ہیں۔ پیر کی قسمیں دی جا رہی ہیں۔ آج جب معصومہ کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے وہ شاید کمسن دلہن کو پہلو میں دبائے سو رہے ہوں گے۔

ایک دم غصّے کا طوفان ان کے سینے میں جاگ اٹھا۔ بٹوے میں نوٹ سرسرانے لگے۔ لعنت ہو نکاح پر! کیا دھرا ہے نکاح میں؟ ان کا نکاح بھی تو بڑے قاضی صاحب نے پڑھایا تھا، جو ایک بوڑھے رئیس کے لاتعداد نکاح پڑھا چکے تھے۔ آج وہ نکاح ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ بے حقیقت ہو چکا تھا۔

لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ دو چار موالی دیر سے انکے اِرد گرد منڈلا رہے تھے۔ ایک دم سے کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ کیا حماقت کی انھوں نے! روپے ساتھ لیے پھر رہی ہیں۔ ایک دو نہیں پورے پانچ ہزار۔ انھوں نے ہتھیلیوں پر سے ریت جھاڑی۔ وہ گھر کی طرف ہو لیں۔ جب گھر پہنچیں تو ساری بلڈنگ میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر ننگی ٹانگوں کی قطاروں کو پھلانگتی وہ تیز قدم چلیں۔

ہلکی سی ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور اندھیرے سے معصومہ نکل کر ان سے چمٹ گئی۔

"امی! امی جان! میری امی جان!" اس نے کانپتے ہوئے جسم کا سارا بوجھ ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ ستاروں کی ملگجی روشنی میں انھوں نے دیکھا: معصومہ کا گریبان تار تار تھا۔ ساڑی میں بھنبانقے ہو رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی سفید ریشمی گردن پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ ایک کان کی لو سے خون بہہ کر جم گیا تھا، جیسے اسے بھوکے کتوں نے بھنبھوڑا ہو۔ وہ اسے کلیجے سے لگا کر سوکھی سوکھی ہو گئیں۔ اپنے سارے منصوبے بھول گئیں۔ انھوں نے سوچا تھا وہ اسے ڈانٹیں گی۔ گالیاں دیں گی، بدمعاش اور لفنگی کہیں گی تاکہ وہ اپنی شرافت کا بھرم رکھ سکیں، اپنے جرم پر پردہ ڈال سکیں۔ بات حادثہ نہ بن جائے۔ مگر انھیں کچھ بھی نہ یاد رہا۔ جب اندر پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ معصومہ صاف بچ نکلی، اس نے احمد بھائی کا بھرتا نکال دیا تو وہ سناٹے میں رہ گئیں۔

سارے فلیٹ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھوڑے دوڑ گئے ہیں۔ پانی کے سارے گھڑے چکنا چور تھے، گلاس لڑھکے پڑے تھے۔ چائے کا سیٹ چورا ہو چکا تھا۔ الگنی کے کپڑے کیچڑ میں پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے کرچی کرچی۔

مارے غصے کے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک زور کا طمانچہ انھوں نے معصومہ کے گال پر مارا۔

"چڑیل! کتیا!"

"امی۔ وہ بدمعاش..." معصومہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

٥ "چپ بدمعاش کی بچی۔ غضب خدا کا! گھر واکر کے رکھ دیا۔ اب تیرے باوا بھریں گے۔" انھوں نے تو وہ دونوں ہاتھوں سے کلیجے سے لگا لیا۔ "یا پروردگار مجھے موت کیوں نہیں دیتا؟ یہ چار چار مینیں میری چھاتی پر دھری ہیں۔ اوپر سے کرتوت تو دیکھو۔ حرام زادی۔ چھنال۔" وہ معصومہ پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ ماں جس نے گھڑی بھر پہلے اپنی بچی کی سلامتی پر اسے کلیجے سے لگایا تھا، نوٹوں کی سرسراہٹ سے سہم گئی۔ کل روپے واپس کرنے ہوں گے!

انھوں نے معصومہ کا کوئی عذر نہ سنا۔ وہی پھٹے پرانے بھیگے چیتھڑے پہنے وہ چٹائی پر جھکی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔

صبح تڑکے وہ احسان صاحب کو دیکھ کر ایسے لرزیں جیسے قصائی کو دیکھ کر گائے۔ مگر وہ بڑے پیار سے مسکرا کر پاس بیٹھ گئے۔

"ابھی احمد بھائی کے پاس سے آ رہا ہوں۔ عجیب الو کا پٹھا ہے۔ سالے کو میں نے بڑی ڈانٹ پلائی۔"

چپ چاپ بیگم نے نوٹوں کی گڈی نکال کر احسان صاحب کے پاس پھینک دی۔ "ارے یہ کیا؟" وہ بڑی نرمی سے بولے۔ اور روپے گننے لگے۔ "اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ سالہ بالکل ہی اناڑی ہے۔ اصل میں بہت پی گیا تھا۔ میں نے سسرے کو بہت ڈانٹا۔ وہ تو کہو اپنا فلیٹ پچھلی طرف ہے اور پاس والے فلیٹ والے ناسک گئے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کو خبر ہو جاتی تو کمبخت جیل میں دھرا ہوتا۔" وہ روپیوں کو سہلانے لگے

پھر روپے ان کی طرف کھسکا دیے: "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ناسمجھ ہے ابھی۔ راہِ راست پر آجائے گی۔ تم ماں ہو، سمجھا بجھا سکتی ہو۔"

گلا نہ بھر آیا ہوتا تو بیگم کہتیں کہ کیا سمجھاؤں؟

"خدا قسم روکیوں رہی ہو؟ مکان والے سے میں نے کہدیا ہے، وہ دوپہر کو آئے گا کرایہ لینے۔ دو چار کپڑے لتے تو بنوا دو۔ ایسا کرو مارکیٹ چلی جاؤ مول چند کے ہاں میرا اکاؤنٹ کھلا ہوا ہے۔"

تو احمد بھائی ناراض نہیں۔ بلکہ انھیں تو چھوکری کی یہ ادا بے حد بھائی۔

دنگائی چھو

"کسم سے کیا دنگائی چھوکری ہے۔" انھوں نے اپنی سوجی ہوئی ناک پر برف کا ٹکڑا رگڑ کر کہا۔ انکے بھی سارے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ پھر بھی ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ "کیا سالی ایک دم ہرنی کا مافک ہے۔"

حامک

"پر سیٹھ اتنا پی کر بچی کو ہلکان کرنا کہاں کی انسانیت ہے؟"

احمد بھائی ہیں ہیں کرنے لگے۔

"آج جو ہوئے جادے؟ بابا اس فلیٹ میں اپنے کو ایک دم نہیں چلنے گا۔"

"آج نہیں۔"

"کائیکو؟"

"بس ایسے ہی۔"

"کیا بات کرتا ہے تم؟ سالہ پانچ ہزار لیا۔ اور ...."

"میرے کھاتے میں ڈال دو۔"

"تمہارا کھاتا ہیں ؟"

"ہاں ۔ پرسوں تک سورج مل سے دلوا دوں گا ۔ کیا سمجھتے ہو سارے بمبئی میں تم ہی ایک لکھ پتی ہو ؟"

"ارے وے تم کیا بنڈل مارتا ۔ ہم کب بولا ؟"

"سیٹھ سچی بات سنو گے ؟"

"بولو"

"یہ لونڈیا جو ہے نا ۔"

"ہاں !"

"وہ تمہارے بس کی نہیں ۔"

"کائیکو ؟"

"اماں گاودی ہو نرے ۔ چھٹانک بھر کی لونڈیا نے مار مار کے بھوسہ بھر دیا ۔"

"نئیں نئیں ، ایسا بات نہیں ۔ بابا ہم نیٹ پیے لا تھا ۔ ایک دم نیٹ ۔ ہمارے کو کچھ دکھائی نہیں پڑا ۔ اور چھوکری سالا اتنا مست کہ کیا بولے تم سے ۔ ہم ذرا ہاتھ لگایا کہ مارا ماری کرنے لگی ۔"

"سوچ لو ۔"

"بس آج جو ہو ۔"

"اماں کیا اُلّو کا پٹھّا پن کیے جا رہے ہو ؟"

"کائیکو ؟"

کاہیکو ؟

ہو سے تم دیا
ں مارہ

احمد بھائی کے
تحت دو

ں نئیں
نیٹ پیے لا تھا
ایک دم

" ایکساں طوطے کی طرح جو ہُو کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اچھا ایسا کرو، وہ فلوری ہے نا۔"

" ہم سے سالہ فلوری کی بات مت کرو۔ کیا تھرڈ کلاس چھوکری۔ تم کیا سمجھتا ہے ہمارے کو؟"

" اچھا بابا بگڑنے کیوں ہو؟"

" بگڑے کاہے کو نہیں۔ پانچ ہجار دیا۔ کوئی کمتی ہے؟"

" اماں نواب میں کیا کر دوں؟ لونڈیا کے ہاتھ پیر باندھ کر پکڑا دوں؟"

" نئیں ایسا کب بولا ہم۔ پن جرا بولو نا چھوکری کو۔ ایسا مارا ماری ایکدم نہیں چلے گا۔"

" پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔"

" مرگا، کون سا مرگا؟"

" تمہارا باپ!" احسان بھائی نے چڑ کر دو چار موٹی موٹی گالیاں نکائیں۔

" سنو۔" احمد بھائی بڑے لاڈ سے بولے۔

" کیا؟"

" تمہارے کو گگو کا ڈانس مانگتا ہے پھر بھی؟"

" گگو کا ڈانس ہوگا تو پکچر سپرہٹ سمجھو۔"

" تو پھر ایسا کرو تم یو سالہ ڈانس۔ ایک نہیں دو لیو۔"

" مطلب؟"

"ارے مطلب کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ ہم کیا بولا؟" سیٹھ ہنسے۔

"جو ہو؟"

"سیٹھ نے دانت نکوسے۔

"ہوں۔" احسان میاں لاپروائی* سے سگریٹ سلگانے لگے۔ مگر احمد بھائی پر تو معصومہ کا بھوت سوار تھا۔

"بات کروں گا آج۔"

"کیا سالہ تم اتنا دن سے بات کرتا، بات کرتا۔" احمد بھائی چراغ پا ہوگئے۔ "ایک دم چار سو بیس ہے تم!"

"دیکھو سیٹھ!"

"کیا؟"

"جوتے کھانے کی باتیں تو کرو مت۔" جب سے سیٹھ پر معصومہ کا عشق سوار ہوا تھا احسان صاحب بڑے گستاخ ہوگئے تھے۔ انھیں معلوم تھا سیٹھ بڑا ضدی ہے، ایک بات کی دھن ہو جائے تو پھر اِدھر کی دُنیا* اُدھر ہو جائے کسی طرح نہیں ٹلے گا۔

"ہاں خوب یاد آیا۔ وہ مگن لال ڈریس والا کا بل پڑا ہے۔"

"کوئی واندا نہیں۔ کل دے گا چیک۔ ہم ناں کب بولا؟"

"وہ مول چند کو فون کر دیجیے گا۔"

کھلاس "مول چند؟ ہم کل اسکو چیک دیا۔ بابا تم ہمارے کو کھلاس کر دیگا۔ ہم....."

"افوہ ۔ کس چغد سے پالا پڑا ہے ۔ اماں یار پکچر کے لیے نہیں ۔ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکیوں کے پاس کپڑے نہیں ۔ میں نے باندرا میں بنگلہ کا انتظام بھی کر لیا ہے ۔"

"اچھا تو ایسا ہو نا ۔ سیٹھ ہنہنائے ۔ ہم شام کو ساڑی پہنچا خوب دے گا اور بول چغد کو بھی فون کر دے گا ۔ ین جو ہو ۔"

"اچھا بابا جو ہو بھی جائے گا ۔"

[illegible]

"بیگم نے نوٹوں کا بنڈل واپس اٹھایا تو کچھ ہلکا لگا ۔ گنا تو تین ہزار !"

"اگلے ہفتے دے دوں گا ۔ فلم کی ڈلیوری دینی ہے ۔" احسان صاحب مسکرائے ، مگر بیگم سمجھ گئیں کہ وہ اپنا کمیشن لے گئے ۔

"مگر ۔ ۔ ۔"

"کیوں گھبراتی ہو ؟" انھوں نے بالکل شوہرانہ انداز میں کہا "شام کو ساڑھیوں والا آ رہا ہے "

"آپ کو ساڑھیوں کی پڑی ہے ۔ یہاں ہزار خرچ جان کو لگے ہیں ۔"

"تم دیکھتی جاؤ ۔ اللہ کارساز ہے ، سب کچھ ہو جائے گا ۔ ہاں بھائی وہ بنگلے کا میں آج طے کرا دوں گا ، کب تک شفٹ کر سکو گی ؟"

"مجھے کون سے سامان سمیٹنے ہیں ۔ نیا سیٹ وہیں جا کر خریدنا پڑے گا ۔"

"کیوں خریدتی ہو ؟ میرے پچھلے محل والے سیٹ کا پورا فرنیچر پڑا ہوا ہے ۔ الٹرا ماڈرن ہے ۔ سیٹھ سے کہہ دوں گا ، وہ یہاں لا کر جما دے گا ۔"

"مگر ۔ ۔ ۔"

"کیا مگر؟"

"معصومہ!"

"ناسمجھ ہے، رسانیت سے سمجھانا ہوگا۔"

سمجھانا ہوگا؟ وہ کیسے سمجھائیں گی؟ لڑکی بالغ ہوئی تو مارے شرم کے انھوں نے بات بھی نہ کی۔ باقری بوا سے کہا۔ انھیں نے پالا تھا، انھیں نے سمجھا دیا۔

باقری بوا! اُف! اچھا ہوا جو آنکھیں مند گئیں۔ ہر وقت پیچھے پڑی رہتی تھیں:

"اے پاشا دوپٹہ سر کو ڈالو، یوں ننگے سر پھرتے شریف بہو بیٹیاں؟"

کیا مجال جو کوئی لڑکی اونچی آواز سے بول جائے:

"ہائے پاشا غیر مرداں کو کاناں میں آواز جاتا۔ چپکا بولو بیٹے!"

وہ ہوتیں تو؟ نہیں، باقری بوا نہیں ـ نوابی شان نہیں۔ کچھ نہیں۔ کوئی نہیں!

معصومہ بانو منہ پھلائے بیٹھی دائیں ہاتھ کی چھنگلی میں ناخن پر سے کیوٹکس کھرچ رہی تھی۔ احمد بھائی دو چار دن کے لئے سورت گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو آنکھ کی سوجن اتر چکی تھی۔ ناک پر بھی کھرنڈ آگیا تھا اور وہ اس وقت امی کے پاس بیٹھے فرنیچر کی فہرست بنا رہے تھے۔

اسے دیکھ کر انھوں نے نہایت بے حیائی سے دانت نکوس دیئے۔ وہ بھنّائی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ ٹرک آیا تو گھر کا کوڑا کرکٹ لادا گیا۔

احمد بھائی کی موٹر میں سب بیٹھے۔ انھوں نے اسے آگے اپنے پاس بٹھانا چاہا، مگر وہ تنک کر دور جا کھڑی ہوئی۔ بیگم ہنس پڑیں اور سلیم کو آگے بھیج کر اسے پاس بٹھا لیا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" انھوں نے پیار سے اس کی لٹ سنوارتے ہوئے کہا۔

"اُنہہ!" عاجز ہو کر اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"قسم خدا کی ایسا طمانچہ مارا ہوگا کہ دانت جھڑ جائیں گے۔ سر پر ہی چڑھی جاتی ہے سور نی۔"

بنگلے میں سامان اتر رہا تھا تو معصومہ ایک طرف بے تعلق سی کھڑی ہو گئی۔

"بھول ہوئی بابا۔ معاف کر دو۔" احمد بھائی پاس آکر بولے۔

"ہنہ!" معصومہ نے ناک سکیڑی۔

"بولو تو اُٹھک بیٹھک کرے۔ ناک پکڑ کر تین سلام کرے۔ ہمارے سے غلطی ہو گیا۔ لو کان پکڑتا ہے ہم۔" انھوں نے دونوں کان پکڑ کر کہا۔ معصومہ کو ہنسی آگئی۔ نہ جانے ان کی گھگو جیسی صورت پر یا اپنی بے کسی پر۔ بیگم نے بھی سمجھایا:

"کتنا کچھ کر رہے ہیں اپن لوگوں کے لیے۔ ڈھائی سو ہے کرایہ اس بنگلے کا!"

"تو وہیں چلیے نا، وہاں ستر روپیہ تھا۔"

"ہوں! اور وہ سٹّر کون دے گا؟" انھوں نے سمجھایا اور معصومہ نے سمجھ لیا۔ اس کا غصہ اڑن چھو ہو گیا۔ پھر وہی ہنسی مذاق اور قہقہے گونجنے لگے۔ خوبصورت کپڑوں اور زیورات کا کس بچّی کو شوق نہیں ہوتا؟ اپنی سکت پھر اس نے مدافعت کی، پھر بھول گئی۔ اتنی ننھی نہ تھی کہ اپنی ہنسی کا مول نہ جانتی۔

اور پھر ایک دن احمد بھائی کے دام وصول ہو گئے۔ اور معصومہ بانو نیلوفر بن گئی اور بیگم کی نوابی لوٹ آئی۔ وہی کھانے پینے کی ریل پیل۔ قدم قدم پر نوکر۔ سلیم میاں کا نام فوراً بڑے شاندار اسکول میں لکھوا دیا گیا۔ موٹر چھوڑنے اور لینے جاتی۔ بیگم وہی صبح گیارہ بجے سو کر اٹھنے لگیں۔ جیسے بُرا خواب دیکھا تھا، آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔ صرف نواب نہ تھے۔ تو نازبرداریوں کو احسان صاحب کیا کم تھے؟ اب تو وہ بقول کسے کھیتی کاٹ رہے تھے۔ اتنے سال جتنا گہرا کنواں کھودا تھا اتنا ہی میٹھا پانی پی رہے تھے۔ خوب! پہلے تو بیگم کا بار کچھ ان پر بھی پڑ جاتا تھا۔ مگر اب تو دونوں وقت کا کھانا بندھا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹی سے بھی میل جول شروع ہو گیا تھا۔ انھیں بھی اب یقین ہو گیا تھا کہ احسان صاحب کے بیگم سے صرف ایسے تعلقات تھے جیسے ایک بدنصیب عورت کے شوہر کے عزیز دوست کے ہونا چاہییں۔ انھوں نے سب کے فائدے کا خیال رکھا۔ بیگم نے ہاتھ کھول کر لین دین شروع کیا۔ ذرا سی کسی کی سالگرہ ہو جاتی اور وہ بنارسی جوڑے اور سونے کے زیور لے دوڑتیں۔

ویسے اب وہ عمر آگئی تھی کہ واقعی ان کے بھائی بہنوں جیسے تعلقات ہی رہ گئے تھے

بیگم ان کی احسان مند تھیں۔ ان کے سوا بیچاری کا تھا کون؟ اگر وہ نہ ہوتے تو منجدھار سے ناؤ کون ترا کر لاتا؟ جھوٹوں کو مانگتے تو وہ بے دریغ دیتیں۔ مگر احمد بھائی کچھ کبیدہ خاطر سے رہتے تھے۔ نیلوفر کا رویہ ویسا ہی معشوقانہ تھا۔ وہ انھیں بے طرح جھکاتی۔ وہ آتے تو بیٹھی بچوں کے ساتھ تاش یا کیرم کھیلا کرتی۔ وہ کمرے میں بلاتے تو ٹالے جاتی۔ بڑی مشکل سے بیگم بھیجتیں تو بات بے بات لڑنے لگتی۔ ہاتھ جھوڑ بیٹھتی۔ بلی کی طرح پنجے مارتی۔ روٹھ کر اماں کے ساتھ جا لیٹتی۔ احمد بھائی منڈلاتے پھرتے، خوشامدیں کرتے، رشوتیں دیتے تو وہ نہایت بے دلی سے بے گار ٹال دیتی۔ احمد بھائی ساری رات کبھی نہیں رہے۔ ان کے سسر کا حکم تھا: چاہے کہیں جاؤ رات کو سو گھر آ کر۔ بارہ بجتے ہی انھیں سنڈریلہ کی طرف بھاگنا پڑتا۔ کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتی، گالیاں بکتی اور پھر جوتم پیزار کرتی۔ ایک دم بھوت سوار ہو جاتا تو کتّے کی طرح بھونکنے کا حکم دیتی اور بری طرح پیچھے پڑ جاتی۔ بیچارے کو بھونکنا پڑتا۔ پھر وہ خوب تالیاں بجاتی۔ اپنا جوتا پھینک کر حکم دیتی: چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل کر بھونکو پھر منہ سے جوتا اٹھا کر لاؤ، پھر بھونکو اور جوتا پہناؤ۔ موڈ آجاتا تو احمد بھائی خوب بھونکتے، دانتوں سے جوتا اٹھا کر لاتے، اور وہ پھر پھینک دیتی۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم سب کے سامنے کہتی گدھے کی بولی بولو۔"

"اس وقت نہیں، بعد میں، باد میں۔"

"نہیں ابھی بولو۔"

"کہدیا بابا اس وقت نہیں ــ پیچھو سب بولے گا۔ پہلا ادھر ایک پپّی دیو۔"

"نہیں ــ ابھی، اسی وقت بولو۔ گدھے کی بولی بولو۔"

"کچھ دماغ خراب ہوا ہے؟ بدتمیز کہیں کی۔" بیگم ڈانٹتیں

"ہمارے بیچ میں کوئی مت بولو ــ ہاں۔" نیلوفر اڑ جاتی۔ "مما آپ چپ رہیے۔"

"معلوم ہوتا ہے تیری شامت آئی ہے۔" بیگم غرّاتیں، مگر احمد بھائی کہتے: "عاسک ماسوک کا مخول ہے، تم کا ہیکو بیچ میں آتا؟" اور وہ گدھے کی بولی بولتے۔ مگر اتنی دیر میں کہ نیلوفر کا موڈ خراب ہو جاتا اور وہ انھیں خون تھکوانی۔ کبھی احمد احسان صاحب سے شکایت کرتے۔ وہ اب تھک چکے تھے۔

وہ عمر آگئی تھی کہ وہ خود معشوق بنتے، بیوی بچے ان کی سیوا کرتے، رعب مانتے، مگر ان کی تو دونوں طرف شامت تھی۔ بیوی ادھر گالیاں دیتی، بچے رتی برابر عزت نہ کرتے، اوپر سے نیلوفر کے مظالم! توبہ!!

احسان صاحب نے انھیں بہت سمجھایا کہ نیلوفر کی بات کا بھروسہ نہیں۔ وہ ایک بدذات لونڈیا ہے، اسے بہت سر نہ چڑھاؤ۔ مگر احمد بھائی چاروں طرف سے جوتے لات کھاتے کھاتے بدحواس ہو چکے تھے۔ ادھر چند مہینوں سے نیلوفر نے انھیں بہت ستایا تھا۔ ایک دفعہ ان کے پیٹ میں ایسی لات ماری کہ غریب کو ہرنیا کے اپریشن کے لیے پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا۔ وہاں سے آئے تو بے طرح مذاق اڑانے لگی۔ ایسا بدحواس کیا کہ ان کے دل میں ڈر بیٹھ گیا۔

پسینے چھوٹنے لگے۔ سونے کا ورق چڑھی گولیوں سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا، الٹا اختلاج ہونے لگا۔ اور ان کی ابتر حالت پر وہ قہقہے لگاتی۔ گندے گندے تکلیف دہ مذاق کرتی۔ ادھر جس فلم میں احمد بھائی نے پیسہ ڈالا وہ ڈبہ ہو گیا۔ حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔

احسان صاحب اپنی دانست میں چٹان پر براجمان تھے۔ گھر میں بیوی بچے شان و شوکت سے تھے۔ ادھر بیگم سے دلچسپی ہنسی مذاق تک محدود ہو گئی تھی، کیونکہ حال ہی میں انھوں نے ایک ایکسٹرا لڑکی سمن کو ایک دم سائیڈ ہیروئن بنا ڈالا تھا۔ سبک نقشے والی سانولی سلونی سمن کو وہ ڈانڈا سے اٹھا لائے تھے۔ سات پشت سے اس کے باپ دادا مچھلیاں پکڑتے آئے تھے۔ خشک مچھلیاں ٹورتے ٹورتے وہ ایک دم ایکسٹرا بنی اور سال بھر کے اندر پروڈیوسروں کے چمچوں کے سر پر چڑھ کر احسان بھائی تک آن پہنچی۔ ان پر کچھ اس کی شوخی کا ایسا نشہ چڑھا کہ جھٹ رٹز ہوٹل میں کمرہ لے کر رکھ لیا۔ ابھی اس کے سر کی جوئیں بھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ وہ سلیکس اور ٹی شرٹ پہنے، دو فلمی چوٹیاں گوندھے گھومنے لگی۔

پتی ورتا مسز احسان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کماؤ مرد کو سات خون معاف ہیں۔ اور حالانکہ فلم فلاپ ہو رہے تھے مگر احسان صاحب بہت تھے جڑیں شریف تھیں، سارا روپیہ ادھر ادھر سے سمیٹ کر انھیں کے ہاتھ میں دے دیتے۔ اسلیے وہ کافی مطمئن تھیں۔ مرد ذات کہیں منہ کالا کرتا پھرے مگر گھر بار سے غافل نہ ہو تو پھر کیسی شکایت؟ باندرہ میں زمین لی تھی، اس کا پٹہ

بھی بیوی کے نام تھا کہ کبھی کو بُرا وقت پڑے قرقی آئے تو گھر کا سارا سامان
بیوی کے نام ہو، کوئی ہاتھ نہ لگا سکے۔ احسان دیوالیا ہو کر پھر کسی اور کے نام
سے نئی کمپنی چالو کر دیتے۔ پہلی کمپنی ان کے اپنے نام سے تھی، دوسری میں انھوں
نے اپنے سالے کا نام ڈال دیا۔ الّو کا پٹھا سا تھا بیچارہ۔ جب کمپنی کا دیوالہ
نکلا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ احسان صاحب نے اسے کھوکھرا پار کی طرف سے
پاکستان بھگوا دیا۔ اب یہ تیسری کمپنی ان کے رشتے کے بھانجے بھتیجے کے نام سے
تھی۔ کرتا دھرتا وہ خود تھے۔

دنیا بھی کتنی عجیب ہے! جب ہفتہ بھر بعد ایک دن احسان صاحب مہابلیشور
سے سمن کی آؤٹ ڈور شوٹنگ سے لوٹے تو گھر ڈھنڈھار پڑا تھا۔ بیوی ان کے
نہایت معتبر منہ بولے بھائی اور پرائیوٹ سکریٹری کے ساتھ بھاگ گئی
تھیں۔ دونوں لڑکیاں پڑوسیوں نے رحم کھا کر سنبھال لی تھیں۔ چھوٹا لڑکا آیا
کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ اس سے تو یہ کہہ کر گئی تھیں کہ سینما جا رہی ہیں۔ سامان گھر
میں تھا ہی کتنا؟ ایک ٹرک میں آگیا۔ آیا سمندر پر بچے کو گھما کر لوٹی تو گھر کے
سامنے بیٹھی دونوں بچیاں دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ اندر دو چار ٹوٹے
پھوٹے برتن اور تھوڑا سا بے کار سامان پڑا تھا۔ بیگم نے احسان صاحب کے
کپڑے تک مصلحتاً ساتھ لے لیے۔ ان کے دست مظہر کے تو آ نہیں سکتے
تھے، کیونکہ وہ تو سانڈ کا سانڈ تھا اور احسان صاحب منحنی سے آدمی تھے،
مگر وہ انھیں زک دینے کے لیے سب کچھ لے گئی۔ اناج کا دانہ تک نہ چھوڑا۔
تعجب کی بات تھی کہ ایک سیدھی سادی گھریلو قسم کی عورت اپنی عمر سے

چھوٹے جوان کے ساتھ کیسے سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئی؟ مگر مظہر اتنا کم عمر نہ تھا جتنا زمانے نے اسے بنا رکھا تھا۔ اس کی کامیابی کا ایک گُر یہ بھی تھا کہ وہ ہر شخص کو بڑے بھائی اور صاحب کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ آیا۔ بگڑے نواب کا بیٹا تھا۔ ماں بہنوں کے زیور سے ہی بمبئی میں کئی سال گذارا ہو گیا۔ اگر خود اس کی جان کو جھمیلے نہ لگ گئے ہوتے تو شاید اور کچھ دن عیش کرتا۔ لیکن اس ذرا سی عمر میں یار لوگوں نے وہ اسے وہ چکر پھیر دیں کہ دیوانہ نکل گیا۔ کئی سال تو عشق عاشقی سے فرصت نہ ملی۔ نہ جانے کتنی لتیں لگیں اور چھوٹیں۔ جب ہوش آیا تو خود کو ایک بوڑھی ہیروئن کی ناز برداریاں اٹھاتے پایا۔

اور پھر مظہر نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا۔ جب اس بوڑھی ہیروئن نے اس سے بھی کمسن چھوکرے کو گھر بار کا مالک بنا لیا تو وہ نہ جانے کہاں سے لڑھکتا پڑھکتا ایک طرح دار پروڈیوسر کا چمچہ بن گیا۔ وہ جو کبھی دوسرے چمچوں کے لیے پتیلے کا کام دیتا تھا! جب پتیلا چمچہ بن جائے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اسے چمچہ بازی کے تمام گُر آتے تھے۔ وہ مختلف پروڈکشنز میں رہا۔ جس کے ساتھ کام کرتا بس اسی کا ہو رہتا۔ آہستہ آہستہ اسی کے گھر میں سونے لگتا، کیونکہ وہ دو تین تین بجے رات تک پارٹیوں کا انتظام کرنے کے بعد بالکل نڈھال ہو جاتا۔ وہ کون سا کام تھا جو وہ نہیں کر سکتا تھا! وقت بے وقت اگر پروڈیوسر چڑیا کا دودھ یا بیل کا انڈا مانگتا تو وہ ٹیکسی لے کر بمبئی کا کونا کونا چھان مارتا۔ اور بیل کے انڈے سے بھی زیادہ عجیب شئے لے کر لوٹتا۔ جس کے

خوب

گھر میں رہتا رشتہ دار بن کر رہتا۔ ان کی بیوی سے فوراً ماں، بہن یا بھابی کا رشتہ لگا لیتا۔ اس کی ماں کو امّاں کہتا۔ اس کی ساس سے بالکل داماد کی طرح ملتا۔ اس کی بہنوں کو کنوار پنے کا غم غلط کرنے میں مدد دیتا۔ اس کے بچّوں کو باپ کی مصروفیت کی وجہ سے شفقتِ پدری دیتا اور شوہر کی جدائی میں آنسو بہانے والی بیوی کے سر دبا تھ گرماتا اور اس کے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لیتا۔ ایک طرف وہ اپنے مالک کو داشتہ سپلائی کرتا۔ دوسری طرف اس کی بیوی کے سینے میں بھڑکتی ہوئی سوتیاہ ڈاہ کی جلن پر مرہم رکھتا۔ اگر بیوی کو آپا کہتا تو داشتہ کو فوراً بھابھی بنا لیتا۔ اس لیے اس سے سب خوش تھے۔ دنیا کا کوئی کام ہو وہ فوراً کر دیتا۔ چاہے حاجی کے ہوٹل سے نان کباب لانے ہوں یا نیوی مِیس سے وسکی، پونا سے گانے والی کا انتظام کرنا ہو یا مچھلی کے شکار کی تیاری، خام فلم چاہیے ہو یا اسٹاک شاٹس۔ مظہر یہ تمام مہیا کر دیتا۔

جس پروڈیوسر کے ساتھ چپک جاتا اسے خدا سمجھنے لگتا۔ ساری انڈسٹری میں اسی کے گیت گاتا پھرتا۔ اس کی ایسی پبلسٹی کرتا کہ پھر پیسے خرچنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ بس جہاں جاتا اس کی ذہانت، عقلمندی اور طراری کے افسانے سناتا:

"واہ صاحب واہ! کمال کر دیا صاحب نے تو۔ یعنی کیا شوٹ لیا ہے کہ سالا کیمرہ مین کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہو گئی۔ کیا پکچر بن رہی ہے۔ قسم سے پونیس کے اتار بے نہیں اترے گی۔ کیا ہیں یہ آپ کے شانتا رام اور محبوب!"

اس کے عیبوں تک کی شیخی مارتا:

"صاحب آج تین مہینے سے سیٹ کھڑا ہے۔ بس دن میں مشکل سے ایک آدھ شوٹ ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک سونگ پر چالیس ہزار فٹ فلم کوڑا ہو گیا۔ صاحب اصلی سنگ مرمر منگوا رہے ہیں۔ صرف دو شوٹ ہیں اس سیٹ کے اور کمال یہ ہے کہ فرش دکھائی بھی نہیں دے گا۔ کلوز شاٹ ہیں۔ مگر ہمارے صاحب کو بس ضد ہے۔ یعنی کہ جو وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہونا ہی چاہیئے، نہیں تو موڈ نہیں آتا۔"

یہی وجہ تھی کہ جب ایک پروڈیوسر کا دیوالہ نکل جاتا تو وہ اسے ورثہ کے طور پر دوسرے پروڈیوسر کے سر چپکا جاتا۔

یہی وجہ تھی کہ احسان صاحب کو منظور پر اتنا اعتبار تھا کہ خود اپنی ذات پر نہیں تھا۔ ان کی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اتنی پارسا بیوی اور سچا دوست کیسے دغا دے گئے۔ کئی دن تو بالکل سناٹے میں پڑے رہے۔ ادھر سمن نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو وہ سوتیا ڈاہ سے جل مری اور ایک دم روٹھ گئی۔ رٹز ہوٹل کے بل کا ماتم کرتی، گالیاں دیتی۔ مول چند بزاز کے کھار والے فلیٹ میں جو عرصہ دو ماہ سے خالی پڑا تھا، اٹھ آئی۔ مول چند نے حال ہی میں اونرشپ کے فلیٹ بنوا کر بڑا مال کمایا تھا۔ فلم اسٹاروں کا بڑا دیوانہ تھا۔ اس کے حسابوں سمن فلم اسٹار تھی! اسی زمانے میں احسان صاحب کو پیراٹایفائیڈ نے دبوچ لیا۔ فلم کا حساب تو گڈمڈ چلتا ہی ہے۔ بلیک کی چھوٹی رسیدیں بھی ابھی پوری نہیں بنی تھیں، قرض دار ٹینٹوے پر سوار تھے، اس لیے وہ اپنی

پہلی بیوی کے پاس لکھیم پور یا انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔

(دنیا میں نمود اور … ماحاصل) جی ہاں یہ فلم لائن ہے۔ یہاں ہر پہلی بیوی سے ایک اور پہلی بیوی ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی لائن ہے۔ یہاں عشق، شادی اور بیوپار، سب گودڑ کی پوٹلی کی طرح ہے۔ فلمی آدمی کو بارہا شادیاں رچانا پڑتی ہیں۔ ایک تو وہ شادی ہوتی ہے جو والدین نوعمری میں کر دیتے ہیں۔ جب بیوی بچے ایک مستقل طعنہ بن جاتے ہیں اور گھر میں گھسنا محال ہو جاتا ہے تو وہ بھاگ کر فلم لائن میں پناہ لیتا ہے۔ اور اگر گھر جنوائی ہو تو ساس سسر ہر نوالے پر سو جوتیاں رکھ کر دینے لگتے ہیں۔ جب ساری نوکریاں ملنے کی عمر ختم ہو جاتی ہے تو ملنے جلنے والے اسے مرض کی دوا سمجھنے لگتے ہیں۔

تب اسے وہ فلمی معجزے یاد آتے ہیں: محبوب ایک ایکسٹرا تھے، آج فلم انڈسٹری کے مائی باپ ہیں۔ شانتا رام اسٹیج پر ناچا کرتے تھے۔ اشوک کمار پچاس روپیہ مہینہ کے اسسٹنٹ تھے۔ سب کے سب کامیاب اور بڑے بڑے لوگ کچھ نہیں سے سب کچھ بن گئے۔ (خوب) اور وہ اپنی بیوی کا بچا کھچا زیور لے کر، یار دوستوں سے سوٹ مانگ کر، سوٹ کیس اور ہولڈال ادھار حاصل کر کے بمبئی روانہ ہو جاتا ہے۔

بمبئی پہنچ کر وہ کچھ دن ہوٹلوں میں رہتا ہے۔ پھر جب حالت گرنے لگتی ہے تو وہ سامان کسی کے گھر میں ڈال کر کھانا مفت خوروں کے ساتھ کھانے لگتا ہے۔ کپڑے کسی کے کھاتے میں دھلواتا ہے، ناشتہ کسی کے ہاں کر لیتا ہے اور سونے کو جہاں بھی رات کو دیر ہو جائے پڑ رہتا ہے۔

صبح ہی صبح کسی اسٹوڈیو میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کبھی ہیرو یا ولین کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی بوریت سے بچنے کے لیے اسے جھیل جاتے ہیں۔ فلم آرٹسٹوں کا نہ کوئی کلب ہے، نہ کوئی تفریح کی جگہ، نہ کسی چیز میں دلچسپی لینے کا وقت۔ اس قسم کے لوگوں سے، جو ذرا مسکا لگانا جانتے ہیں، ان کا وقت کٹ جاتا ہے۔ ہر ہیرو شوٹنگ کے بعد گھر پر ایسے ہی پر کٹے کبوتروں کو گھیرے دوسرے فنکاروں کی برائیاں بکھانا کرتا ہے۔ شراب کا شغل چلتا ہے۔ امیدوار کو بھی کچھ حلق تر کرنے کے لیے مل جاتی ہے۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ اس کا چمچہ بن جاتا ہے۔

اس عرصے میں وہ واپس لوٹنے کا وعدہ کر کے بیوی سے اور زیور بکوا کر پیسہ منگا لیتا ہے۔ جب اس کے جوتے پھٹ جاتے ہیں، کپڑے تار تار ہونے لگتے ہیں تو وہ کچھ دن کے لئے گھر لوٹ بھی جاتا ہے۔ مگر اس عرصے میں اسے بمبئی کی ہوا لگ چکی ہوتی ہے اور فلم لائن کا چسکہ پڑ جاتا ہے۔ گھر والوں پر وہ خوب اپنی دوستوں کا رعب ڈالتا ہے۔

ہزاروں اور لاکھوں کی باتیں کرتا ہے اور پھر اِدھر اُدھر سے پیسے بٹور کر بمبئی آ جاتا ہے۔ اگر وہ اچھا مسکہ باز ہے تو بہت جلد کسی ہیروئن یا ہیرو کے کوآپریشن سے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر بن جاتا ہے۔ چوگنے سود پر اُدھار اسٹوڈیو اور خام فلم کا انتظام کر کے وہ ہیرو سے بغیر معاوضہ لئے دس دن کی شوٹنگ کی بھیک مانگ لیتا ہے۔ یا تو خود ہی ڈائرکٹر پروڈیوسر

بن جاتا ہے یا اپنے کسی کنگال دوست سے فلم ٹھکوا لیتا ہے۔ بظاہر وہ اور ڈائرکٹر خود کچھ نہیں لیتے، مگر جب فلم کی بزنس ہو جاتی ہے تب اس کے ختم ہونے تک ٹھاٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ فوراً اپنی پتلونیں اور نائیلون کی بش شرٹیں بنوا لیتا ہے۔ ایک فلیٹ لے کر اسمیں ہی آفس کھول دیتا ہے۔ جرنلسٹوں کو کھلا پلا کر خوب پبلسٹی کرواتا ہے۔ ایک دم اسکی بڑی پوزیشن ہو جاتی ہے۔ ہیرو بننے کے خواہش مند نوجوان اور دوشیزائیں مع اپنی ماں یا نانی کے اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک ہزاروں مفت کام کرنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی مفت کہانی لئے چلا آتا ہے، کوئی مفت میوزک دینے پر تلا ہوا ہے:

"آپ فلاں شاعر کو ایک گانے کے ہزار روپے دیتے ہیں۔" میں مفت لکھنے کو تیار ہوں۔ ہٹ ہو جائے تو دے دیجیئے گا۔"

"بس میں تو سکرین پر نام دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہانی لے لیجیئے، چاہے کچھ نہ دیجیئے۔" مگر یہاں بھی کام سے پہلے نام بیچنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہوشیار پروڈیوسر نام کسی اور کا بیچتا ہے، کام کسی اور سے اونے پونے لے کر ٹھوک دیتا ہے۔ اب کون اس سے سر مارتا پھرے۔

اور اسی زمانے میں اسے کسی ایکسٹرا یا ناکام سائیڈ ہیروئن سے عشق ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اگلی پکچر میں ہیروئن کا چانس دینے کا جھانسہ دے کر اپنا الو سیدھا کر لیتا ہے۔ اگر وہ صابر اور سیدھی سادی ہے تو وہ اسے کچھ دن اور جھیل لیتا ہے، پھر کسی اور کو ہیروئن بنانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسے وہ غلطی سے ہیروئن بنا دے وہ فوراً نیک اور پارسا بن کر اپنی اماں ابا کے زیر سایہ لاکھوں کمانے لگتی ہے۔

اگر اس کی فلم ہٹ ہوئی تو وہ اس سے قطعی ناطہ توڑ لیتی ہے۔

اس لیے وہ ذرا بھی جاندار لڑکی دیکھتا ہے اور وہ اسے پسند آجائے تو اسے گھیر گھار کر شادی کر لیتا ہے۔ وہ بھی پروڈیوسر کی بیوی بننے میں زیادہ شان محسوس کرتی ہے، کل تک سیٹ پر دھتکاری جاتی تھی، آج بیگم صاحب کہلاتی ہے۔ بات بے بات ہر ایک پر رعب جماتی ہے۔ پیٹھ پیچھے لوگ اسے بھیانک گالیاں دیتے ہیں، منھ پر سلام جھاڑتے ہیں۔

احسان صاحب کی بیگم بھی کسی زمانے میں رنجیت میں مستقل سائیڈ ہیروئن تھیں عموماً کامیڈین کے ساتھ دھول دھپّوں کے سین میں رول کیا کرتی تھیں۔ مگر اب لوگ انھیں بھول بھال گئے تھے۔ وہ بھی بال بچّوں میں گھری ہوئی بالکل میلی کچیلی گرہستن بن گئی تھیں۔ مگر احسان صاحب کی آئے دن کی عشق بازیوں سے اکتا کر کبھی کبھی وہ بھی کسی میں دلچسپی لے لیا کرتی تھیں۔

مظہر سے کئی سال سے میل جول بڑھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بیوی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ سب حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اب جو سمن کا قصہ چلا تھا، اس سے بیگم خار کھائے بیٹھی تھیں، پہلی فرصت میں وہ کوڑا کرکٹ احسان میاں کے سر پر جھاڑ و دے کر وہ چلتی بنیں۔

اور احسان میاں کچھ نہ کر سکے۔ کیونکہ سارا روپیہ چوری کا تھا اور بیگم ان کی فلمی بیوی تھیں۔ نکاح کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ اس روزِ بد کی کسے امید تھی؟

ان کے جانے کی بیگم کو بڑی خوشی ہوئی۔ پاپ کٹا۔ کمبخت بہت اتراتی تھی،

جیسے نیلوفر تو بیسوا ہے اور وہ بالزادی بڑی بھلی بیوی ہے۔ کیا ناک چڑھا کر بات کرتی تھی۔ دوسرے احسان میاں کا کمیشن جاری تھا۔ اور اب انھیں چونکہ ان کی مدد کی ضرورت نہ تھی، اس لئے کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اب وہ احمد بھائی سے براہِ راست چپ چاپ سودا کرلینا چاہتی تھیں۔ کئی بار انھوں نے بے رخی برتی، مگر احسان صاحب ایک ڈھیٹ تھے۔ کھسیں کاڑھے ہنسا کرتے اور پیسہ لیے بنا نہ ٹلتے۔ کتنی ہوس تھی۔ کمبخت کا کسی صورت تو بھرتا ہی نہ تھا۔ اِدھر اُدھر الگ ہاتھ مارتا تھا۔ انہوں نے ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کان بھرنا شروع کیے۔ اُٹھتے بیٹھتے رونا روتیں۔ ہر بات کا حساب کرتیں۔ ساری بے ایمانیوں کے پول کھول دیے۔

کس قدر بدل گئی تھیں ان چند سالوں میں وہ! ان کی باتوں میں بازاری رنگ جھلکنے لگا تھا۔ اگر کوئی عورت احمد بھائی کی طرف نظر بھر کے بھی دیکھ لیتی تو وہ سوتیاہ ڈاہ سے جل کر مرنڈا ہو جاتیں۔ وہ کھلی کھلی گالیاں سناتیں کہ توبہ۔ نیلوفر کو ویسے ہی احمد بھائی سے خدا واسطے کا بیر تھا، ان باتوں کا بہانہ لے کر وہ بالکل ہی ان کا کچومر نکال دیتی۔ بات بات پہ منھ بھر کے گدھا، پاجی، حرامی پلا کہہ دیتی۔ اب تو وہ جوتی بھی اٹھا کر مارنے سے نہ چوکتی۔

"اے ہے بدبخت رزق کو جوتا مارتی ہے۔" بیگم سہم کر کہتیں۔ ان کی دانست میں احمد بھائی آٹے کی اس بوری کی طرح تھے جس کا منھ مستقل کھلا رہتا تھا۔ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ روز ہی وہ کچھ نہ کچھ لے آتے۔ نیلوفر نظر اٹھا کر نہ دیکھتی۔ بیچارے اداس ہو جاتے:

کیا بیبی کبھی بھی خوش نہیں ہوتا؟" وہ اسے فلمی بیبیوں کی طرح بیبی کہتے تھے کچھ بھاؤ اونچا لگنے لگتا تھا۔

"ارے بنتی ہے احمد بھائی۔ منہ پر نہیں ظاہر کرتی، آپ سے چھیڑ میں اسے مزہ آتا ہے۔"

وہ منجھی ہوئی نائیکہ کی طرح کہتیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ گُر قدرت نے ضرورت کے لحاظ سے خود بخود سکھا دیے۔ بیگم پر خوب بوٹی چڑھ رہی تھی۔ رنگ نکھر کر گلاب کی پتی ہو گیا تھا۔ میک اپ بھی ڈٹ کر کرنے لگی تھیں۔ پہلے تو کبھی کبھی بالوں میں مہندی بھی لگا لیا کرتی تھیں، مگر جس دن سے بیبی کے بال پرمانٹ سیٹ کرانے ہیر ڈریسر کے ہاں گئیں، اس نے رائے دی تو خضاب لگانے لگیں۔ بال کافی بھدرے ہو گئے تھے، مگر پہلے سے بہت جوان لگتی تھیں۔ ٹرے ٹھسے کے بلاؤز سلواتیں جو نہایت نوکیلے چولی کٹ کے بُری طرح پھنسے ہوئے۔ گوشت کے بوٹے ابل پڑتے۔ سوجے ہوئے سڈول ہاتھ انگوٹھی چھلوں سے لدے رہتے۔ جب وہ چاندی کی پٹاری سامنے رکھے گلوریاں بنائیں تو بس سارنگی کی گنگناہٹ اور طبلے کی تھاپ کی کسر رہ جاتی تھی۔

سلیم کو انھوں نے پنچگنی سینٹ پیٹر میں داخل کروا دیا تھا۔ لڑکیوں کو بھی اس سال وہیں کمینز میں چھوڑ آئیں۔ گھر کی فضا کمسن بچوں کے لیے سازگار نہ تھی۔ نیلوفر اور احمد بھائی کا عشق بالکل بلیوں جیسا چیختا، چنگھاڑتا ہوا کرتا تھا۔ بچوں کے دلوں میں کھد بد ہوا کرتی۔ دروازے بھیڑ دیتی تھی۔ نشے میں چور ایک دن احمد بھائی نے کیا حرکت کی کہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی حلیمہ کی گھگی بندھ گئی۔ روتی ہوئی آگرہ وہ

ماں سے چمٹ گئی۔ احمد بھائی کچھ یوں ہی سا* تولیہ پیٹے اپنی صفائی پیش کرنے چلے آئے۔ ہاتھ چلا* چلا کر کہنے لگے:

"ایک دم بدماس چھوکری ہے۔ پرائیویٹ روم میں کائے کو جھانکا؟ ہم کچھ کیا۔ اتنا بولا: 'بابا ادھر ہم بات کرتا ہے' اگلسی میں جاکے کھیل۔' اوپر سے بولتی ہم اس کا چھاتی نوچا۔ کیا بابا۔ ہم کائے کو نوچتا؟ کیا ہم ایسا موالی ہے؟ بولو!"

بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ٹالا۔ اور نیلوفر کو دیکھو! بے حیا کبھی کبھی ہنستی رہی، جیسے کچھ بات ہی نہ ہو۔ بڑی اب کافی ہوشیار ہوگئی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ احمد بھائی کا نیلوفر سے کیا رشتہ ہے؟ احسان صاحب بھی اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتے تھے، بات بے بات گود میں گھسیٹ کر دبوچتے:

"ارے کیا اسکول میں وقت ضائع کرنی ہے۔ اسے ناچ سکھاؤ۔ لچھو مہاراج سے میرے بڑے اچھے مراسم ہیں۔" وہ رائے دیتے اور بیگم کا خون کھول اٹھتا۔ ایک بھینٹ تو انھوں نے چڑھا دی، مگر خاندانی بننے کا پروگرام انھیں بڑا گھناؤنا معلوم ہوتا۔ نیلوفر ویسے بڑی لاابالی تھی، مگر بھائی یا بہن پڑھنے میں کوتاہی کرتے تو چار چوٹ* کی مار دیتی۔ کبھی ان کی کتابیں ہاتھ آجاتیں تو بڑے پیار سے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھتی، جیسے ان کے ورقوں میں اپنا* وہ کھویا ہوا زمانہ ڈھونڈ رہی ہو جب وہ اسکول جاتی تھی۔ اُف، کیا دن تھے وہ بھی! کیا سر جوڑ کر گوئیوں* سے باتیں ہوا کرتی تھیں! زندگی کی باتیں، پیار اور چھیڑ چھاڑ کی باتیں، کنوارے خوابوں کی دھڑکتی ہوئی باتیں، جن میں اُبٹن کی خوشبو تھی،

مہندی کا رچاؤ تھا۔ اور سہاگ پڑے کی مہک تھی۔ اور پھر وہ ان چپ چاپ گونگی شہنائیوں کے سُروں میں کھو جاتی، جو اب کبھی نہیں بجیں گی۔ پھر وہ چونک پڑتی۔ احمد بھائی کے رال میں لپٹے ہوئے ہونٹ اس کی کمزور کنواری ہستی کو جھنجھوڑ ڈالتے اور وہ بڑی بے دردی سے جو چیز ہاتھ آجاتی کھینچ مارتی۔ وہ بڑی مرکھنی ہو گئی تھی۔ ایک دن مذاق ہی مذاق میں احمد بھائی کے ایسی بے جگہ لات ماری کہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح اڑانے لگے۔ بڑی مشکل سے سیڑھیاں اترے۔ دوسرے دن چڑھتے وقت ایسی ٹیسیں اٹھیں کہ پسینے میں ڈوب گئے اور وہیں سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ سیدھے ہسپتال گئے۔ معلوم ہوا ہرنیا کا اسٹرینگولیشن ہو گیا۔ اگر ذرا اور لاپرواہی برتی جاتی تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے۔

واچہ نرسنگ ہوم میں دو ہفتہ پڑے رہے۔ روز نیلوفر کی دوائی ڈالتے" مگر سو سو نخروں کے بعد جاتی اور لڑنے لگتی۔ ادھر ان کے سسر نے ڈوریاں کھینچنا شروع کیں۔ فلم میں لگایا ہوا روپیہ ڈوب چکا تھا۔ ہسپتال کا بل ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ بیگم سانپ بنی جو مٹھی میں تھا دبائے تھیں۔ تھا بھی کیا؟ خرچ سے خرچ تھے۔ پانچ سو تو بچوں کا ہی نکل جاتا تھا۔ پھر آئے دن پارسلیں جاتیں۔ بیگم خود دوڑ دوڑ کر جاتیں۔ گھر میں بھی لنگر خانہ کھلا ہوا تھا۔

احسان صاحب سسرال سے لوٹ آئے تھے۔ احمد بھائی سے اب اُن کی ٹھنی ہو گئی تھی۔ بقول کسے اب احمد بھائی بھی کڑکے ہو چکے تھے۔ آدھی بنی فلم کے ورلڈ رائٹ جس کے پاس تھے اس نے آفس پر قبضہ کر لیا۔ ہر طرف احمد بھائی ہنڈیاں دے چکے تھے۔ اُدھر ڈسٹری بیوٹر فلم کی ڈلیوری کا تقاضہ کر رہے تھے۔

مگن لال ڈریس والے نے الگ دعویٰ ٹھوک دیا۔ فرنیچر والے نے نوٹس دیدیا
پے در پے تین فلاپ فلم بنائے۔ بال بال قرضے میں بندھ گیا۔
کتنا سمجھایا حرام زادی نیلو فر کو کہ زیور لے، یہ کوڑے کرکٹ میں پیسے مت
غارت کر، مگر اسے تو جیسے ضد تھی۔ کالی پیلی گندے رنگوں کی ساڑیوں کے علاوہ
کبھی جو کسی چیز میں دلچسپی لے جائے۔ اور ساڑیاں بھی وہ پہنتی کب تھی؟ بس ایک
میلا سا ہاؤس کوٹ پہنے گھوما کرتی تھی۔ لاکھ سمجھایا مگر کبھی بن ٹھن کر تیار نہ
ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ جب فلیٹ پر بھی ٹاپ آ گئی تو حواس گم ہو گئے۔

اس برے وقت میں حیرت ہے کہ کام آئے احسان صاحب! جیسے ہی
سنا، فوراً سورج مل کو لے کر بھاگے آئے۔ اسی وقت فلیٹ خرید کر کاغذ
انھوں نے بیگم کے قدموں میں ڈال دیے اور سب کو ان کی موٹر میں بھر کر
"گے لارڈ" میں کھانا کھلانے لے گئے۔

احمد بھائی نے بڑا ماتم برپا کیا۔ سورج مل مسکرا کر اٹھے اور چل دیے۔
بیگم روکتی رہ گئیں۔

"آپ ان سے نبٹ لیجیے، میں شام کو آؤں گا۔"

احمد بھائی نے بڑے فیل مچائے۔ سورج مل کو گولی مارنے کی دھمکی دی۔
"اے ہے دیوانہ ہو گیا ہے کمبخت! وہ تو دو گھڑی کو آیا اور چلا گیا۔ خدا قسم
کیا شریف آدمی ہے۔ بیبی کی طرف بری نگاہ تک نہ ڈالی، ہاتھ پکڑنا تو بڑی بات
ہے۔"

"پن سالہ تو کتنا بے ایمان ہے۔ ہم جرا بیمار پڑا اور تم اُدھر دوسرا سیٹھ چالو

کر دیا۔ پکا چور ہے تم لوگ۔"

"اے تو کیا سڑک پر جا پڑتے؟ اس بے چارے نے بڑے وقت میں سہارا دیا، ورنہ تم تو وہیں اپنی جورو کے کلیجے میں گھسے بیٹھے رہتے۔ ہم یہاں ویران ہو جاتے تو تمہاری بلا سے۔"

"کیا بکواس کرتا تم۔ ہم سالہ جورو کے پاس کب گھسا؟ ہم اپنا سامان لینے کو گیا۔ ہم اس کو طلاق دے دے تم بولو تو۔ بس آج ہی نکاح ہو جاوے، سالہ کھٹ کھٹ ختم ہووے۔"

"نکاح؟" بیگم نے قہقہہ لگایا۔ "سیٹھ جب وقت تھا اور ہم نے تمہاری جوتی پر نکاح کے واسطے ناک رگڑی تھی تو کیا ٹکا سا جواب دے دیا تھا: 'نکاح کا لفڑا نہیں مانگتا۔' ہے ہے بچی کو بچا لیا اللہ نے، ورنہ میں کمبخت تو خود ہی چولہے میں جھونکنے کو تیار تھی۔"

"پر اب ہم بولتا نا۔ نکاح بھی کرے گا۔ ہاں اور کیا؟"

"تو نیلوفر سے پوچھ لو۔ وہ راضی ہو تو میری بلا سے۔" بیگم جانتی تھیں کہ نیلوفر کیا جواب دے گی۔ چڑھانے کو بن کر بولیں۔

"نا بابا! اس کا مستک پھر گیا ہے۔ ہم تم کو بولتا۔"

"ہم کو کیا بولتا؟" منہ چڑھا کر بولیں۔

"تم اس کا گارجین ہے۔"

"اوئی میں کیوں ہوتی گارجین پھارجین؟ اللہ رکھے ننھی نہیں اب وہ۔ اپنی مرضی کی مختار ہے۔ اس کا جو جی چاہے کرے۔ ایک چھوڑ دس نکاح کرے، میری

جولی ہے۔"

"وہ ایک دم سالہ ہلکٹ ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ کمرے میں بیٹھی ہے، بات کرو جا کے۔"

ڈرتے ڈرتے احمد بھائی کمرے میں گئے۔ نیلوفر مجنٹا رنگ کی اطلس کا ہاؤس کوٹ پہنے فرش پر پڑی تھی۔ اس کی ایک ران کھلی تھی۔ آج احمد بھائی نے دروازہ بند کر لیا۔

"بیبی!" وہ ڈرتے ڈرتے بولے۔ سفید ہاتھی دانت جیسی پنڈلی پر سنہری رونگٹے جگمگا رہے تھے، جیسے کسی مشاق سنار نے کندن جڑ دیا ہو۔

"بیبی ڈارلنگ۔" احمد بھائی گھگھیائے۔

"کیا ہے؟" اس نے میگزین کے پیچھے سے جواب دیا۔

"کیسا ہے تم؟"

"اچھا ہے ہم۔ کائیکو؟" نیلوفر احمد بھائی کی صحبت میں بڑے لٹکے سے ویسے ہی بولنے لگی تھی۔

"تم ناراج ہے کیا ہم سے؟"

"کائیکو؟" اس نے ان کی نقل اتاری۔

"پھر تم ہمارے کو کس نہیں دیا۔"

"کس مانگتا؟ لیو کس۔" اس نے اپنے گول گول ہونٹ پھلا کر ٹھوڑی آگے بڑھا دی۔ مگر جب احمد بھائی اس پر جھکے تو وہ لوٹ لگا کر دور چلی گئی۔ جھونک میں اوندھے ہو گئے بیچارے۔ ڈاکٹر نے احتیاط کا حکم دیا تھا۔

جب وہ ہلکان، پسینے میں تر، لرزتی ٹانگوں سے سر جھکائے نیچے اتر رہے تھے تو نیلوفر کے قہقہے ان کے پیچھے تالیاں بجاتے دوڑنے لگے۔

"اے کیا ہوا؟ کیوں چلے گئے اتنی جلدی؟"

"فیوز اڑ گیا۔" نیلوفر نے قہقہہ لگایا۔ بیگم کی خاک سمجھ میں نہ آیا۔ نیلوفر پاگلوں کی طرح اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

"دیوانی ہو گئی ہے کمبخت!" انہوں نے بچوں کو باہر دھکیل کر اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ مگر جب نیلوفر نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر تفصیل بتائی تو بیگم بھی مسکراہٹ نہ روک سکیں۔

"اے ہے — بڑی ظالم ہے تو۔" وہ بولیں۔

"واہ، ہم کیا کرتے؟" نیلوفر اٹھلائی اور لاتوں سے چادر دور پھینک دی۔ "اُف کیا گرمی ہے۔"

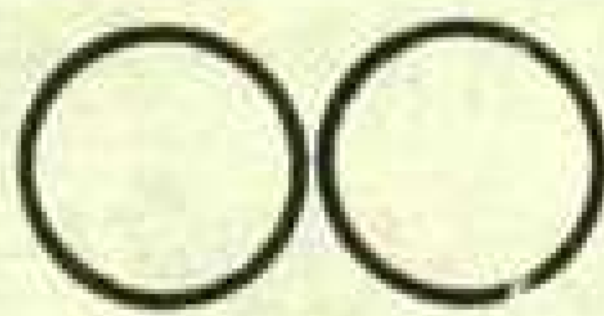
نیلوفر کو بیگم نے جنم دیا تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے نہلا بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت اس کی ننگی جوانی کو ملگجے بستر پر پھیلتا دیکھ کر تھرا اٹھیں، جیسے خود انھیں لے جا کر کسی نے چوراہے پر ننگا کر دیا ہے۔ قسمت نے دھکے تو ضرور دے تھے، مگر ان میں اب بھی شرم و حیا موجود تھی۔ احسان صاحب تو خیر غیر تھے، انھوں نے نواب صاحب کے سامنے جوانی کے دنوں میں بھی کمرے میں بجلی روشن نہ کرنے دی۔ اور نیلوفر کا دھندا تو تھا ہی تاریکی کا۔ سو کینڈل پاور بلب کے نیچے اس کا دمکتا ہوا بدن انھیں جلا کر

راکھ بنا رہا تھا۔“

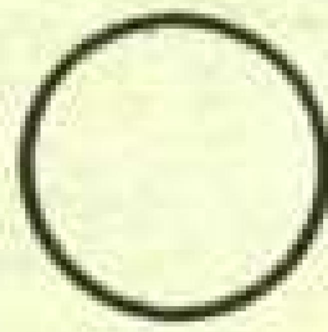
”اٹھ بے حیا۔ کیا سانڈنی کی طرح پڑی اینڈ رہی ہے۔“

”اوں، ہمیں گرمی جو لگتی ہے۔“ وہ اور پسر گئی۔

دروازہ بند کر کے وہ لوٹ آئیں، اور سلیم کے ایک دھول جڑی جو کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پندرہ دن کی چھٹیوں میں پچگنی سے آیا ہوا تھا اور واپس جانے کے خیال سے اداس ہو رہا تھا۔



تیسرا باب



احسان صاحب لوٹ کر آئے تو معلوم ہوتا تھا کہ نہ جانے کتنے برس کھٹیا گوڑ کر آئے ہیں۔ بے حد لاغر۔ ایک دم خضاب چھوڑ بیٹھنے سے عجیب چتکبرے، جنگلی بلاؤ کے سے روکھے بال؛ مٹی جیسی مردہ رنگت؛ بوسیدہ لباس۔ ان کی عورت اور سکریٹری نے بالکل ننگا کر کے چھوڑا تھا۔ اصلی بیوی کے پاس اگر کچھ تھا بھی تو وہ چھدام خرچ کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہاں سے خالی دل، خالی ہاتھ لوٹے۔ بیگم کے پاس دو وقت کے کھانے کا سہارا تھا، مگر وہ بھی بار بار جتاتی رہتی تھیں کہ انھوں نے اپنا کمیشن پا لیا۔ اِدھر جب سے احمد بھائی کو لات لگی تھی وہ ذرا خسیس ہو گئے تھے۔ نیلوفر کو تو سوائے کھی کھی کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مکان کا کرایہ چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سلیم کا خرچ ہر مہینے بڑھتا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کا بل اگر دس تاریخ تک ادا نہ ہو جائے تو جینا دوبھر ہو جائے گا اتنا خرچ اور ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی — کیا ننگی نہائے، کیا نچوڑے!

احسان صاحب کے پاس اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ صبح ہی صبح اٹھ کر کسی اسٹوڈیو کا رخ کرتے۔ وہیں کسی پرانے جان کار آرٹسٹ کے میک اپ روم میں ڈٹ کر کسی بدنصیب پروڈیوسر کی قبر کھودتے۔ ناشتہ کے بعد اسی آرٹسٹ کے ساتھ لگے لگے سیٹ پر چلے جاتے۔ کچھ لوگوں کو اب تک ان کی اصلی حالت کا اندازہ نہ تھا۔

کسی زمانہ میں پروڈیوسر تھے، ہاتھی لٹے تو بھی سوا لاکھ کا۔ چھوٹے موٹے ایکسٹرا انھیں

گھیر لیتے:

"کہیے احسان صاحب پکچر کب شروع کر رہے ہیں؟"

"بس اب مہورت کرنے ہی والا ہوں۔ کل دیوانند سے طے ہو گیا۔ سنیل دت کو بھی رول پسند ہے۔ ڈبل رول ہے ایک امیر لڑکے کا، ایک غریب کا، دونوں ہم شکل ہیں۔ صاحب کمال کی اسٹوری ہے۔ راجندر سنگھ بیدی سے ڈائلاگ کا ہو گیا ہے۔ کسی سے کہنا نہیں، کہانی دراصل مکھ رام شرما کی ہے، مگر وہ اپنا نام کسی وجہ سے نہیں دینا چاہتے۔"

جو انھیں جانتے تھے وہ سمجھ جاتے تھے کہ زٹیلیں ہانک رہے ہیں۔ انجان لوگ فوراً ان کی خاطروں میں لگ جاتے۔ کیونکہ وہ فوراً کہتے:

"ہیروئن کوئی نئی لڑکی لینا چاہتا ہوں۔" اور تمام لڑکیوں کے رشتے دار انھیں راجہ اندر بنا کر گھیر لیتے:

"ارے بھائی چائے لاؤ احسان صاحب کے لیے۔ لیجیے سگریٹ لیجیے۔ ایک لڑکی ہے، دیکھیے گا؟ کیا یہ آپ کی مینا کماری اور وجینتی مالا ہیں! بچھو مہاراج کی سدھائی ہے۔ کتھک میں واقعی بچھو مہاراج کا جواب ہندوستان بھر میں نہیں۔ بھئی کیا لڑکی ہے احسان صاحب!"

"کون سی لڑکی؟"

"ہے ایک۔ آپ کسی دن ٹیسٹ لیجیے۔"

"وہ سریتا کا ذکر کر رہے ہو؟"

"ارے نہیں صاحب۔ آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں؟ سریتا سالی کا تو باپ بڑا دنگا کرتا ہے۔ پرسوں نرائن صاحب کے سیٹ پر پی کر آ گیا۔ بات بے بات گالیاں

بکنے لگا کہ جان بوجھ کر زک دینے کے لیے ڈائرکٹر اسے ریہرسل میں بھیج رہا ہے۔ ولین شاٹ میں بھیجے تو کوئی بات نہیں، مگر یہ ڈائرکٹر فضول میں ریہرسل کے بہانے بے تکلف ہو رہا ہے۔"

"ارے میاں وہ اس کا باپ نہیں ہے۔"

"مگر اس کی ماں سے سنا تھا کہ شادی کر لی ہے۔"

"شادی کیا؟ ہاں، شادی تو ہاں ہی سے کی ہے، مگر یار ایک دم سالی کباڑا ہے۔ ماسٹر وٹھل کے ساتھ سائیلنٹ فلموں میں ہیروئن ہوا کرتی تھی۔"

"پہلے تو سریتا ہی کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اس نے اسے کئی جگہ کام دلوایا، مگر سالا ہجنتہ کا فسادی ہے، ہر ایک کی گنتی نیوٹی بگاڑ دی۔ جس دن شوٹنگ ہوگی نخرے کرنے لگے گا۔ سب جگہ سے نکالا گیا۔"

"امل لعنت بھیجو سالی ٹکھیائی ہے۔"

"اوہو! آیئے آیئے میڈم۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہو گئی ہیں۔" سریتا ایک بلوچن کا ڈریس پہنے، اونچی ایڑیوں کی مدد سے پانچ فٹ دو انچ کا قد ٹھمکاتی، اِلا لنگتی پھلا نگتی چلی آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے والے ایک دم جادو نگری کے پری زاد کی طرح لوٹ پوٹ کر اس کے عاشقِ صادق بن گئے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے۔ یہ فلمی دنیا ہے۔ یہاں ہر چیز مصنوعی ہے۔ یہاں کالے کو گورا اور گورے کو کالا بنانے کا پلاسٹر ہیں۔ گنجے سروں کے لیے وگ ہیں اور بال والے سروں کے لیے ربڑ کی ٹوپیاں ہیں۔ چپٹی پھیلی ناکوں کو شیڈ دے کر پتلا ستواں بنا لیجیے۔ چندھی آنکھوں میں ستاروں کے بوہیں کوٹ کر بھروا لیجیے۔ بال چھدرے

ہیں تو گنگا دون حاضر ہے، لمبی چوٹی جھولنے لگے گی۔ بال پسے ہیں تو رول بنوا کر انھیں باب فیشن کروا لیجیے۔ دہانا چھوٹا ہے تو چوڑی لپ سٹک لگوا لیجیے۔ ہیروئن سوکھی چھپٹی ہے تو ربڑ کے کولھے اور سینہ کسی اعلا کیمسٹ کی دوکان سے منگوا لیجیے۔ اگر موٹی ہے، جو کہ ہر کامیاب ہیروئن چند فلموں کے بعد ہو جاتی ہے۔ تو اسے تنگ کپڑے پہنا دیجیے۔ الاسٹک کی پٹیاں باندھ دیجیے۔ اور ناپ تول کر کیمرے کے اینگل لیجیے کہ پتلی سلائی سی نظر آئے۔ اگر ٹھنگنی ہے تو اسے چھ انچی چار انچی اسٹول پر کھڑا کر دیجیے۔ جو بہت لمبی ہے تو ہیرو کے اسپیشل اونچی کے جوتے بنوا دیجیے۔ عموماً لمبی ہیروئن کو ہیرو کے پاس کھڑا مت کیجیے، اس کے پیروں پر گرائے رکھیے تاکہ ہیرو دیوزاد لگے، جیسے نوتن کے ساتھ اپنا راج لگتا ہے۔

بات سر بتا سے پھسل کر بیک اپ کے ڈبّے میں گر پڑی۔ جو ابھی اسے گالیاں دے رہے تھے، فوراً اس کو دیکھ کر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے۔ خیریت اسی میں ہے۔ کون جانے آپ آج جسے اپنا چپراسی کہتے ہیں کل وہ پروڈیوسر بن کر آپ کا پالن ہار بن جائے۔ بڑے پروڈیوسروں کا یہاں ذکر نہیں، بلکہ ان کگر متّا قسم کے پروڈیوسروں کا ذکر ہے جو کسی بارسوخ ہستی کے طفیلی ہوتے ہیں۔ کسی بڑے اسٹار کے گرد منڈلانے والے کوّے، جنھیں یہ اسٹار اپنا بلیک کا روپیہ دہاہٹ کرنے کے سلسلے میں پروڈیوسر بنا دیتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھیے انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنے فلم ان کے نام سے بناتے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں سب کو اس دھندے کا پتہ ہوتا ہے۔ ڈسٹری بیوٹر کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم کا اصلی مالک کون ہے اور لفافہ کون ہے؟

عموماً یہ لفافے کی ذات کے پروڈیوسر بظاہر کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ جتنا بھی گھپلا کر کے اڑالیں وہ ان کی کمائی ہے۔ یہ لفافہ پروڈیوسر بڑے کام کا ہوتا ہے۔ نام کو پروڈیوسر اور ہر چیز کا یہی مالک ہوتا ہے، مگر جیسے انگلستان کے شہنشاہ کو تمام حقوق دے کر بھی کچھ نہیں ملتا اسی طرح اس پروڈیوسر کو ایک ایسے کاغذ پر دستخط کرنا پڑتے ہیں جس کی رو سے اسکی سات پشتیں تک گروی ہو جاتی ہیں۔ وہ رتی بھر بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ اگر فلم کامیاب ہو جائے تو اصلی مالک ہر چیز پر قبضہ کر لیتا ہے، لیکن اگر فلاپ ہو جائے تو لفافہ عمر بھر کے لیے بے رنگ ہو جاتا ہے۔

یہ لفافہ عموماً بڑے کام کا ہوتا ہے، حالانکہ عموماً کرٹ کا ہوتا ہے۔ اپنے رسوخ سے یہ تمام آرٹسٹوں سے ہاتھ پیر جوڑ کر، ناک رگڑ کر پیسے کم کرواتا ہے وہ پوزیشن والا اصلی پروڈیوسر خود تو جا کر بھیک نہیں مانگ سکتا، آپ بڑی شان سے ڈٹا رہتا ہے، لفافہ کام نکالتا ہے۔

پھر سریتا کے ذکر میں لفافے پروڈیوسر گھس آئے: اُنہہ! ہٹائیے بھی سریتا کو، یہ پہلے بھی کئی نام بدل چکی ہے، مگر اس میں ہی برکت نہیں تو نام بے چارے کا کیا قصور ہ ” ٹھگنی سی مہاسوں دار لڑاکو مرغی کی طرح ہے۔ اگر فلم لائن میں نہ ہوتی تو کہیں برتن مانجھتی بیٹھی ہوتی اور کوئی فلم بین اس سے آٹوگراف لینے نہ آتا۔ اسے فلم لائن میں دیکھ کر خدا کی مصلحت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اگر یہ فلم میں مس کا کردار نہ ادا کرتی ہوتی تو اب تک یقیناً اپنی ہم شکل کتنی ہی لڑکیاں پیدا کر چکی ہوتی، جو کسی طرح بھی ملک اور قوم کے معیارِ حسن

کو اونچا نہ کرتیں۔ شادی نہ کر کے وہ ہماری جانوں پر کچھ کم احسان نہیں کر رہی ہے مگر شادی تو وہ کر چکی ہے، اس شخص سے جو کبھی اس کی والدہ کا آشنا تھا!

اتنے میں احمد بھائی آن پہنچے۔ کچھ عرصے سے ان کا اور احسان میاں کا رشتہ کچھ آگ اور پانی کے رشتہ جیسا ہو گیا تھا۔ ایک کا ہونا دوسرے کے لیے جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ کھسکنا ہی چاہتے تھے کہ احمد بھائی نے انھیں پھانس لیا اور سیٹ کے پیچھے لے جا کر باتیں کرنے لگے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا احمد بھائی یہ چھوکری تمہارے بس کی نہیں۔"

"پن چھوکری جو ایک دم کنڈم ہووے تو اپن کیا کرے؟"

"سیٹھ چھوکری تو کنڈم نہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے تم ہی کنڈم ہو تو کوئی کیا کرے؟" احسان بھائی جل گئے۔

"کیا بات کرتا تم؟ اکھا بمبئی کا چھوکری ہماری ٹانگ کے نیچے سے نکل گیا۔"

"وہ کوئی کھبائی پون پل پر بیٹھنے والی ہوں گی۔ سیٹھ یہ خاندانی لونڈیا ہے۔ حماقت مجھ سے ہو گئی۔ گاہک دیکھ کر مال کھپانا چاہیے۔ دونی کا منھ کیا۔"

"گرم کائے کو ہونا بابا؟"

"آپ بات ہی ایسی بھونڈی کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی، لونڈیا نے لات ماردی اور آپ دو ہفتہ کے لیے ہسپتال میں جا پڑے۔"

"پن ہم کیا کرے؟ تم بولو نا! اس کا ماں تمہارے کو بوت مانتا۔"

"اماں تم تو سچ مچ گھانس کھا گئے ہو۔ اس کی ماں سالی کیا کرے گی؟ ہاں تم کو ماں چاہیے تو . . ."

"کیا بکواس کرتا تم؟ ہمارے کو یہ مخول پسند نہیں۔"

"ارے بھئی تو میں کیا کروں؟ میں خود پریشان ہوں۔ یہ سالی عورت ذات"

احسان میاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اچھا سیٹھ مجھے ذرا کام ہے۔"

"بات تو سنو۔ کیا سالہ آدمی ہے تم۔"

"سیٹھ میرا اپوائمنٹ ہے۔ مجھے دیو کو آج کہانی سنانا ہے۔ سائننگ منی تیار ہے، بس اگلے مہینے سے شوٹنگ۔"

"کیا تم ہمارے کو اُلّو بناتا ہے۔"

"میں کیا بناؤں گا، وہ تو خدا کی قدرت دیکھ رہا ہوں، اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے پروردگار نے!"

"ایں؟"

"جانے دیو تم نہ سمجھو گے۔"

"ہمارے پیسے کا۔ کیا کچھ تم اریجمینٹ؟"

"ہو جائے گا، وہ بھی ہو جائے گا۔ اچھا تو چلوں۔ تمہاری نظر میں کوئی اچھی سیکنڈ ہینڈ گاڑی ہووے تو . . ." احسان صاحب نے گپ لگائی۔

"تم گاڑی لیتا؟"

"گاڑی کے بغیر بڑی تکلیف ہے۔"

"سالہ گاڑی کا پیسہ ہے تمہارے پاس تو ہمارا پیسہ کائیکو نہیں دیتا۔"

احمد بھائی گرم ہو گئے۔

"اے بھئی میں تو گاڑی نہیں لے رہا۔ وہ اپنا دیپ چند ہے نا' سورج مل کا سالہ' اسے چاہیے۔" احسان صاحب فوراً پلٹ گئے۔

"ہم سب جانتا۔ سالہ تم اس کے نام سے اپنا گاڑی لیتا۔ تم کمپنی کس کا نام سے اسٹارٹ کرتا؟"

"میرا ایک بھتیجا ہے وہ..."

"کیا تم لوگ چار سو بیسی کرتا؟ ادھر ایک کمپنی پھٹ ہوتا اُدھر تابڑ توپ دوسرا کمپنی چالو کر دیتا۔ اچھا بیٹا سمجھے گا تم کو۔ انسالوینٹ کرا کے دم لیگا۔"

"ارے واہ سیٹھ! اپن تو چار سال ہوا انسالوینٹ ہو گیا۔ روپیہ تو تم نے غلام رسول کو دیا تھا' اب میرے سے مانگ رہے ہو۔"

"تم بولا غلام کا رسول کا نام ڈالتا' پن روپیہ ہم دے گا۔"

"اونہہ! یہ تو وہی مثل ہو گئی: طویلے کی بلا بندر کے سر۔ لونڈیا کا غصہ مجھ غریب پر اتار رہے ہو۔ میری مانو تو سیٹھ بادام گھس کے جوارش جالینوس کے سنگ کھاؤ۔ انشاءاللہ..."

"کیا بادام کھاوے۔ سالہ ہمارے کو جلاب آنے کو لگتا۔" سیٹھ بڑی حسرت سے بولے تو احسان صاحب کو ہنسی آگئی۔

"اے سائیلنس! کون الّو کا پٹھا سیٹ کے پیچھے بول رہا ہے؟ نکالو جوتے مار کے۔ اتنا لمبا شاٹ خراب ہو گیا۔ او ہو! آپ ہیں احسان صاحب! معاف کیجیے گا۔" مگر جب احسان صاحب "کوئی بات نہیں" کہتے ہوئے

چلے گئے تو ڈائرکٹر نے جی بھر کے گالیاں دیں: "چور زمانے بھر کے۔ مجھے ڈائرکشن دینے کا وعدہ کیا اور کمبخت نے سال بھر دوڑایا، معلوم ہوا بالکل کڑکا ہے۔" ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ڈائرکٹر احسان صاحب کے ساتھ مل کر باقی کی انڈسٹری والوں کو گالیاں دے رہا تھا:

"ارے صاحب یہ شریفوں کی لائن نہیں۔ یہاں تو بس رنڈیوں اور بھڑووں کی دال گلتی ہے۔"

جیسے احسان کوئی فرشتہ تھے۔ وہ خود اسی ڈائرکٹر کے بارے میں ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ اپنی بیوی کی سفارشوں سے ڈائرکٹر بنا پھرتا ہے۔ اگر ڈائرکٹر نہ بنایا جائے تو موقع بے موقع حق شوہری جتانے پر مصر ہو جاتا ہے۔

ان شوہر یا ڈائرکٹر صاحب کی بھی بڑی لطیف کہانی تھی۔ میاں بیوی اچھے خاصے تعلیم یافتہ طبقے سے تھے۔ امیچور تھیٹر میں دل بہلانے کو کام کیا کرتے تھے۔ نہ جانے کس نے بھڑکا دیا کہ فلم لائن میں جاؤ، گنگا بہہ رہی ہے، چنانچہ آ گئے۔ مختلف دوستوں کے ہاں رہے، آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے گھروں سے ملے، جہاں کام مل سکتا ہے مگر دام نہیں۔ بمبئی میں مہمانداری کب تک چلتی؟ لہٰذا ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ بیوی ہر ایک پروڈیوسر کے پاس جاتیں میاں کا دکھڑا سنا کر اس کے شانے پر آنسو بہاتیں۔ چھوٹا موٹا کام مل جاتا، جسے یہ اپنی کوششوں سے بڑھوا لیتیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ روحانی دوستیاں کرتی ہیں۔ مگر بھلا فلم انڈسٹری والے بھوت چڑیل میں کب ایمان لانے والے ہیں؟ اب میاں کو احساس کمتری ہو رہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے شوہر کے سوا اور کچھ نہیں مانے جاتے۔ لہٰذا وہ ان سے

لڑتے ہیں۔ جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ جس فلم میں کام کر رہی ہوں اس میں کھنڈت ڈالنے پر تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کا سارے اسٹاف سے عشق چل رہا ہے اور وہ ایک سرے سے سب کے جوتے مارنے والے ہیں۔ بیوی ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے پھر اپنے افلاطونی مہربانوں کے سینے پر سر رکھ کر روتی ہیں اور جب تک انھیں کام نہ مل جائے وہ اسی طرح دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ مگر جب کام مل جاتا ہے تو فوراً ہیروئن یا سائیڈ ہیروئن سے عشق لڑانے لگتے ہیں۔ اگر کاسٹ اے ون ہو تو پھر ڈانسر یا سائیڈ ڈانسر ہی پر صبر کر لیتے ہیں۔ پھر وہ حسد ہی میں جلا کرتی ہیں۔ اور اپنے رومانی دوستوں کے شانے آنسوؤں سے تر کرتی ہیں۔ اللہ نے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کبھی نہ خشک ہونے والے سوتے چھپا دیے ہیں۔ آج کل اُنکے میاں کا عشق سربینا سے بڑی دھوم دھام سے چل رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کو یہی غم کھائے جاتا ہے۔ اگر سربینا کی جگہ اس وقت کوئی بڑی ہیروئن ہوتی تو ان کی ذلت نہ ہوتی۔ تب تو شاید وہ خود ان پر مرنے لگتیں۔ تھرڈ کلاس لڑکی پر مرنے میں نقصان ہی نقصان ہیں۔ فرسٹ کلاس ہیروئن سے معاملہ ہو تو جانو ریزرو بینک کی کنجی ہاتھ آ گئی، بڑی سے بڑی دعوت ہو، اگر انھیں بلا وہ نہ آئے تو ہیروئن بھی نہیں جا سکتی۔ چاہے دس کمپنیاں چالو کر کے پروڈیوسر کے باپ بن جاؤ۔ جتنا بلیک کا روپیہ ہے وہ تو خیر اپنا ہے ہی، وہائٹ کی بھی کوڑی کوڑی ہضم کر لو۔ جو وہ کمائی جائے طرح طرح سے اڑاتے جاؤ یا اپنے نام سے جمع کرتے جاؤ۔ جب بوڑھی ہو جائے تو کوئی نئی چڑیا پھانسو۔ یہ حسن و عشق کے سین میں گرم سانسیں بھرنے والی صفِ اوّل کی ہیروئنیں خشک ریت میں غوطے مارا کرتی ہیں۔ انھیں

دنیا ہوس کی نگاہوں سے گھورتی ہے پر دل دینے والا کوئی نہیں جڑتا۔ ایک دفعہ یہ شادی کر لیں تو پھر چنگل سے نہیں نکل سکتیں۔ جو نکلتی ہیں تو جوتے میں سے نکل کر بھاڑ میں گر جاتی ہیں۔ تھرڈ کلاس چھوکری ہو تو فنانسر بیٹھنے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ اور سریتا زندگی میں چاہے شعلہ جوالا ہو، سکرین پر بوبنل مچھلی ہی لگتی ہے مگر جس تیسرے نمبر کے پروڈیوسر کا وہ ساتھ دے جاتی اسے کچھ نہ کچھ فنانس کہیں سے ضرور دلا دیتی۔ اس وقت اس کا ڈانس ہو رہا تھا: ایک کیفے میں وہ ہیرو کو راہِ بد کی طرف لے جانے کے لیے اپنے تمام دھاڑ دار حربے استعمال کر رہی تھی۔ کیفے میں جوا چل رہا تھا اور وہ سب کے پاس دوڑ دوڑ کر ایڈ رہی تھی۔ ہونٹ کاٹ کاٹ کر چھاتیاں تھرکا رہی تھی، مگر یہ ساری حرکتیں سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایکسٹرا آرٹسٹوں کے لیے بالکل مشین کی کھٹ کھٹ بن چکی تھیں۔ کسی کے جذبات برانگیختہ نہیں ہو رہے تھے۔ مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے انسان بھی مشین بن جاتا ہے۔ شدید گرمی، دھول، پگھلتا ہوا میک اپ۔ اور پھر مفت کام کرنے کی وجہ سے دل بجھے ہوئے تھے اور سارے جذبے سو گئے تھے۔ کیونکہ سارے آرٹسٹ اس فلم میں اس شرط پر کام کر رہے تھے کہ بزنس ہو گی تب پیمنٹ ہو گا۔

مگر لوگ گندے مذاق کر رہے تھے۔ سریتا کا اسکرٹ خوب گھیر دار تھا۔ جب وہ لٹو کی طرح چکریاں لیتی تو اس کا گہرے گلابی رنگ کا جانگیا خطرے کی جھنڈی بن کر جھمک جاتا۔ اسسٹنٹ کیمرے کے نیچے بیٹھا کلیپر پر شاٹ نمبر اور تاریخ وغیرہ ڈال رہا تھا۔ ہیر ڈریسر لسی پینے کے بعد پان کھا رہی تھی، تاکہ فائنل ریہرسل

سے پہلے ہیر پن اور ویور نکال کر بال جما دے۔ پروڈیوسر کا خون سب پر حلال ہے۔ چاہے سین میں بال بکھرنے ہی کیوں نہ ہوں، ہیر ڈریسر بلوائی جاتی ہے۔ اور چونکہ نرگس اور مدھو بالا کی ہیر ڈریسر ہے اسلیے ہر دو پیسے کی چھوکری پہلے ہیر ڈریسر بلواتی ہے، جو بال کم بنواتی ہے، اس کی آیاگیری زیادہ کرتی ہے۔ ساری انڈسٹری کی خبریں نائی کی طرح اسے معلوم ہوتی ہیں۔ جتنی منہ چڑھی ہیروئن ہو گی، اتنی ہی بد دماغ اس کی ہیر ڈریسر ہو گی، کیونکہ وہ اس کی ہمراز اور پیغامبر بھی ہوتی ہے۔ وہ عشق چلواتی ہے، چھٹی پترے جاتی ہے۔ ہیروئن کو روپیہ ڈھالنے والی مشین سمجھنے والے رشتہ داروں، ماؤں، نانیوں اور شوہروں کے دکھڑے سنتی ہے اور ان کے ساتھ باتھ روم تک جاتی ہے۔ اسسٹنٹوں کو یوں اکڑوں محو نظارہ دیکھ کر ڈائرکٹر صاحب نے بھی جھک کر دیکھا اور جانگیے کی چمک دمک دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔

"میرے سیٹ پر یہ بیہودگیاں نہیں چلیں گی۔" وہ بری طرح گرجے۔ "بیٹھے گدھوں کی طرح دیکھ رہے ہیں۔ سنسر ایک دم یہ شارٹ اڑا دے گا۔ جاؤ اسے لمبا انڈرویر پہناؤ۔"

سریتا کو جب معلوم ہوا تو اداس ہو گئی۔

مگر اسسٹنٹ سفارش کرنے لگے۔ فلاں فلم میں تو اس سے بھی چھوٹا ہے اور بالکل جسم کی کھال کی رنگت کا ہے، چھوکری بالکل ننگی دکھائی پڑتی ہے۔ ڈائرکٹر چڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بالکل ننگی دکھائی پڑنی چھوکری کی فلم سنسر والوں کی قینچی سے کیوں کر بچ گئی تھی۔ وہ پروڈیوسر ہمیشہ انتہائی قابلِ اعتراض

چیزیں اپنی فلم میں بچائے جاتا تھا۔ جس کی پہنچ ہو وہ سب کچھ رکھ سکتا ہے اور سنسر کی قینچی کترا کر نکل جاتی ہے، ایک فریم نہیں کٹتا۔ مصیبت ان چھوٹے چھوٹے پروڈیوسروں کی ہے۔ لفافہ قسم کے پروڈیوسر جو سنسر کی قینچی سے ایسے لرزتے ہیں جیسے بھیا قصائی کی چھری سے۔ اور چھری بھی کیسی کہ اندھے سانڈ کے سینگ، جہاں جی چاہا بھونک دیے۔ کیسا بھیانک نظارہ ہوتا ہے۔ اندر سنسر ٹرائل ہو رہا ہے باہر پروڈیوسر کو ڈائریا۔ مہینہ بھر سے ایڈیٹنگ کے چکر میں سر پیر کا ہوش نہیں رہا۔ کب فلم ختم ہو گئی؟ کسی کا پورا پیسہ نہیں چکایا۔ ہاتھ پیر جوڑ کر بیوی بچوں کو بیروں میں ڈال کر کسی طرح فلم ٹھوک دی۔ سوائے ایڈیٹر کے اور ڈائرکٹر کے اور ان دونوں اسسٹنٹوں کے سب کا کام ختم ہو گیا۔ دلچسپی ختم ہو گئی۔ اُدھر ڈسٹری بیوٹر سولی پر چڑھائے دے رہا ہے۔ خدا خدا کر کے ایڈیٹنگ ختم ہوئی، اِدھر اُدھر سے مانگ تانگ کر بیک گراونڈ میوزک ڈالا اور بیت سنجا کر سنسر کے آگے رکھ دی۔ جانو بیٹی منڈپ میں بٹھا دی ہے۔ ایگزبیٹر دھمکیاں دے رہا ہے کہ پکچر دو ورنہ ایڈوانس ہضم۔ اس پر پروڈیوسر دم گھونٹ رہا ہے کہ مقررہ ڈیٹ پر ڈلوری نہیں دی تو دام واپس کر دو۔ کرمنل کیس کر دیا جائے گا۔ اُدھر پچھلی فلاپ فلم کے قرض دار گردن پر سوار ہیں کہ اگر ایک بوند بھی ٹپکے تو لپک لیں۔ اور سنسر کے بچاری ہاتھوں میں نشتر تولے لاش پر جھکے ہوئے ہیں۔

قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ صرف تین ہزار فٹ فلم کاٹی گئی۔ دو گانے سو رگ پاش ہوئے۔ تین گانے بری طرح زخمی کہ شاید پلاسٹک سرجری سے سسکتے رہ جائیں۔ بیچ بیچ میں سے ڈائلاگ اور الفاظ اچک لیے گئے۔

لیجئے فلم سنسر ہو گئی ۔ بہت لڑے تو بالکل چھابڑی والوں جیسا سودا پٹ گیا: ہمارا نہ تمہارا، بس آدھا آدھا ۔ یعنی فلم صرف ڈیڑھ ہزار فٹ کٹی آگے پھر مورچہ تیار کیا، دلّی لڑنے چلے ۔ اس کمیٹی کو دکھایا، اس کمیٹی کو دکھایا ۔ اب یا تو ایک دم فلم کوری نکل آئی، صرف دو چار سو فٹ فضول چیزیں نکل گئیں، فلم پاس ہو گئی ۔ اور اگر روایزنگ کمیٹی میں کوئی جنات قسم کے صاحب ہوئے تو فلم بالکل ایک سرے سے بین ہو گئی ۔ کوئی بھروسہ نہیں سنسر کا ۔ سب کسی اندھی قدرت کے ہاتھ میں ہے ۔ تیر نہیں تو تکا تو ہے ہی ۔ کبھی تو معلوم ہوگا فلاں پکچر بین ہو گئی ۔ اور پھر خبر آئے گی کہ اسے تو پریسیڈنٹ اوارڈ ملتے ملتے بچ گیا اور بہت سے فلمی میلوں میں انعامات لینے جا رہی ہے ۔

"مجھے گرمی لگتی ہے ۔" سریتا دیوی جانگیہ بدلنے پر تیار نہیں تھی ۔ وہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر کھلنے والی کہکشاں دیکھ رہی تھیں ۔ جب ان لوگوں کی اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے تو پبلک کا کیا ہوگا؟ ختم ہی تو ہو جائے گی! یہ ڈائرکٹر لوگ ان کے دشمن تھے ۔ ان کی سیکس اپیل کو جان بوجھ کر ضائع کر دیتے تھے ۔ بات یہ تھی کہ ان دنوں سریتا بائی اس بیدردی سے سنسر والوں کے ہاتھوں کٹنے لگی تھی کہ ڈائرکٹر انھیں فلم کے حق میں زہر قاتل سمجھتے، اور پبلک کا یہ حال تھا کہ اگر ایک شاٹ بھی ان کا کولھے مارنے کا، کندھا مارنے کا یا جھرجھری لے کر ہونٹ چبانے کا نظر آجاتا تو دیوانے ہو کر وہیں لوٹ جاتے ۔ وہ فلم عموماً ہٹ ہو جاتی ۔ ان کے سینے کی تھرتھراہٹ دیکھنے کے لیے لوگ لاکھوں نچھاور کر دیتے ۔

"اچھا تو آج کلوز شاٹ ہو جانے دو۔" ڈائرکٹر ٹال گیا۔

کلوز شاٹ میں ذرا نیچے کیمرہ رکھا تو وہ کچھ ایسے گھس کر اور آگے کو جسم پھینک کر کھڑی ہوئیں کہ کیمرہ مین سر ہلانے لگا:

"نہیں چلے گا۔"

"اماں کیا نہیں چلے گا؟" ڈائرکٹر چڑھ گیا۔

"دیکھیے پہلے — پھر بولیے گا۔ میرا کیا ہے؟ مگر سوچ لیجیے۔"

"اُف! ذرا پیچھے ہٹو۔" کیمرے میں جھانک کر بولا، ذرا لیفٹ کو۔ بس بس۔ تھوڑا رائٹ۔ بس — ہیں؟"

ڈائرکٹر نے کیمرہ مین کو دکھایا۔ پھر اسسٹنٹ کو دکھایا۔ پھر سر بیتا بائی کو دکھایا اور احمقوں کی طرح سر کھجانے لگا۔

"لائٹ آف۔" روشنیاں بند کر دی گئیں، میک اپ مین کو بلایا گیا۔

"صاحب مجھے کچھ نہیں معلوم، ڈریس والے سے پوچھیے۔" میک اپ مین نے کہا۔

"صاحب وہ بات یہ ہے! میں نے بہت روکا، وہ مانیں ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ قمر ہے نا۔ وہ لے گئیں۔"

"تو پھر؟ اپنی پراپرٹی میں نہیں؟"

"ہیں صاحب، وہی تو ہیں — وہ "سیر پرستان والے لے گئے تھے۔ انکے یہاں سے بدل کر دو سائز کے آگئے۔ شوٹنگ کے بعد کل گیا تھا، انھوں نے

کہا: کہیں پراپرٹی میں پڑے ہیں، پھر بدل لے جانا۔"

"مگر یہ دو سائز کے تو نہیں چلیں گے۔" ڈائرکٹر اڑ گیا۔

"اچھا بھئی بیک شاٹ لے لو۔" پروڈیوسر نے خوشامد کی۔

"میک اپ!" سرینا بائی بیک شاٹ کے لیے تیاری کرنے لگیں۔

نیلوفر، جو کبھی معصومہ بانو تھی، جو گڑیوں سے کھیلتی تھی اور اندھیرے سے ڈرتی تھی، ہر برسات میں نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر لمبے لمبے پینگ لیا کرتی تھی جسے بہت سے شعر یاد تھے اور بیت بازی میں ہمیشہ اسی کی پارٹی جیتا کرتی تھی، جب ڈرامہ میں اوفیلیہ کا کردار ادا کیا تھا تو سارے اسکول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگی تھیں۔

اسے شیلے سے عشق تھا اور کیٹس پہ دم جاتا تھا۔ بائرن کے نام پہ دل دھڑکنے لگتا تھا۔ انھیں جتنا کچھ پڑھا اور سمجھا تھا، اسی پہ دل دے بیٹھی تھی۔ ابا کہتے تھے: چھوٹی کو ولایت بھیجیں گے۔ سینیئر کیمبرج کر لیتی تو پھر کیا تھا!

مگر یہ خواب تھے ۔ بڑے بڑے جاندار خواب ۔ جن میں اب بھی معصومہ بانو الجھی معلق لٹک رہی تھی۔ مگر نیلوفر اس جال سے پھسل آئی تھی۔ وہ زیادہ تر چاکولیٹ اور ٹافیاں چبایا کرتی۔ چیختے چنگھاڑتے رمبا سمبھا کے ریکارڈ بجا کر ڈنلوپلو کے موٹے گدوں پہ پڑی تھرکا کرتی۔ اس کے ارد گرد "ٹرو اسٹوری"، "ٹرو رومان" اور مختلف قسم کی لڑکیوں کے کنفیشن

پڑے رہتے۔ اس کا دبلا پتلا جسم بڑی تیزی سے بھرتا جا رہا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے؟" بیگم نے اس کے ننگے کولھے پر تھپڑ لگایا۔

"اوں ہمیں گرمی لگتی ہے۔" اوندھے پڑے پڑے اس نے تکلفاً ذرا چادر اپنے اوپر گھسیٹ لی اور ایک موٹا سا چاکولیٹ چبانے لگی۔ پڑوس کے بچے اگلسی کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ ابھی بیگم نے سب کو ادھر سے مار کر بھگایا تھا۔

"تو اب کیا ارادہ ہے؟" انھوں نے ایک کرسی پر سے بلاؤز اور الجھی ہوئی ساڑھیوں کا ڈھیر پلنگ پر پھینک کر جگہ بنائی اور ٹھس سے بیٹھ گئیں ادھر چند مہینوں میں کچھ اور گوشت چڑھ آیا تھا۔

"پنچگنی سے آج آخری نوٹس آیا ہے۔"

"روپے نہیں بھیجے آپ نے؟"

"کہاں سے بھیج دیتی۔ یہ تیسرا مہینہ ناغہ ہوا ہے۔"

"کاہے کا؟" نیلوفر نے کھوئے ہوئے انداز سے یونہی کہہ دیا۔ وہ کہانی کے از حد دلچسپ حصہ پر پہونچ چکی تھی۔ وہ شخص جس نے کہانی کی ہیروئن کو خراب کر کے اس کے بچہ پیدا کرا دیا تھا، اب اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا اور کوئی دم میں وہ اسے اپنی مضبوط باہوں میں لے کر شادی کا وعدہ کرنے والا تھا۔

"میں کہتی ہوں آگ لگے ان کتابوں کو۔" انھوں نے کتاب چھیننا چاہی، مگر نیلوفر نے جھٹ سے چادر کے اندر چھپا لی اور ہنسنے لگی۔

"بے شرم کہیں کی۔ ہر وقت گندی گندی کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ انھوں نے تو تجھے کوڑی کام کا نہیں رکھا۔ قسم سے ایک دن سب کو اکٹھا کر کے آگ لگا دوں گی۔"

"اوں بھئی کیوں؟"

"کیوں کی بچی۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ احمد بھائی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کیا ہوگا؟"

نیلوفر احمقوں کی طرح ہنس دی۔ سوچنا اس نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا۔

"تو ہم کیا کریں؟"

"یہ تو پرسوں ورسوا کس کے ساتھ گئی تھی؟"

"کسی کے ساتھ بھی نہیں۔"

"اور اوپر سے جھوٹ بولتی ہے!" بیگم نے جھونٹے پکڑ کر اس کا منھ اپنی طرف موڑا، نیلوفر ایک جھٹکا مار کر چھوٹ گئی۔ احمد بھائی سے کشتیاں لڑ لڑ کر اسے نئے نئے پینترے آ گئے تھے۔

"منوہر کے ساتھ اور کس کے ساتھ۔" اس نے ہاتھ اونچے کر کے بال سمیٹے تو چادر چھوٹ گئی۔ بیگم کو اس کی بے حیائی پر غصہ آ گیا۔ ڈر کر اسنے ڈریسنگ گاؤن گھسیٹ کر اوڑھ لیا۔

۵ "شرم نہیں آتی۔ رنڈیوں کی طرح ہر کسی کے ساتھ چل دیتی ہے۔"
بیگم اسے احمد بھائی پر رحم کھانے کی نصیحت کرنے آئی تھیں، مگر منوہر کے

ساتھ اس کا جانا آوارگی کا ثبوت تھا! منوہر جو ابھی سیکنڈ ایر میں پڑھتا تھا، پڑوس کے ایک ماسٹر جی کا آوارہ لونڈا تھا اور ہر وقت کھڑکی میں سے نیلوفر کو اشارے کیا کرتا تھا۔

عجب ستم ظریفی تھی یہ نیلوفر کی۔ وہ کچھ اس سے چھوٹا ہی ہوگا۔ دبلا پتلا پھرتیلا سا لڑکا۔ میدان میں کرکٹ کی مشق کرتے وقت وہ نیلوفر کو دیکھتے ہی مردانگی دکھانے لگتا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی نیلوفر کے کمرے کے ساتھ تھی۔ عموماً اس کے پردے دروازے پر موڑ کر ڈال دیا کرتی تھی۔ وہ بظاہر کتاب لے کر اس کے سامنے بیٹھا رہتا اور نیلوفر اپنے کمرے میں آزادی سے چہل قدمی کیا کرتی۔ منوہر منہ پھاڑ دیکھتا رہتا اور کتاب اس کے ہاتھ سے نیچے گر جاتی، تب بھی اسے ہوش نہ آتا۔

ایک دن اس نے جان بوجھ کر اپنا چاندی کے دستے والا برش کھڑکی سے گرا دیا اور جھک جھک کر دیکھنے لگی۔ منوہر تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیر کی طرح دوڑا۔ برش لے کر جب وہ نیلوفر کے کمرے میں آیا تو بیگم کہیں، پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ وہی دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھیں۔

وہ لوٹیں تو نیلوفر کے کمرے کا دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا اور چینے بھن رہے تھے۔ انھوں نے وہی برش لے کر منوہر کے کولھوں پر جو کس کس کر جمایا تو وہ بھاگا دم دبا کر۔ مارے ہنسی کے نیلوفر کو اچھو لگ گیا۔ کسقدر مضحکہ خیز نظارہ تھا کہ ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ بیگم کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہی

برش لے کر وہ لپکیں، مگر ایک چھلانگ مار کر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر وہ آگے بڑھیں تو اسی بہشتی جوڑے میں وہ دھم سے پڑوس کی چھت پر کود پڑے گی۔ لوگوں کو ویسے ہی ان کے چال چلن پر اعتراض ہونے لگا تھا، مگر زیادہ نہیں کیونکہ فلمی علاقہ تھا، جہاں آئے دن ہوحق مچا رہتا تھا۔ لاچار ہو کر وہ سر پکڑ کر کرسی پر گر پڑیں اور منھ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

مگر جب نیلوفر دھم دھم پیر پٹختی غسل خانے میں جانے لگی تو وہ سب کچھ بھول کر اس فکر سے پریشان ہو گئیں کہ یہ کوئی کپڑا ڈھنگ سے نہیں پہنتی، گوشت بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی حال رہا تو کچھ ہی دنوں میں ڈھل جائے گی۔ وہ کتنی تیز رفتار سے عقلمند ہو رہی تھیں۔ "بدی کتنی جلدی اور آسانی سے انسان میں رچ جاتی ہے۔ نیکی کی تلقین کے لیے بڑے بڑے اوتار سر پٹک کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہار گئے۔ بدی دلچسپ ہے، ہنگامہ خیز ہے؛ نیکی کٹھن لوہے کے چنے چبانے کی طرح ہے۔ ساری عمر کی تربیت رانگے کی قلعی کی طرح دو چار تاؤ لگنے سے اتر گئی۔"

مگر بے چاری نیکی کا اس میں قصور تھا نہ بدی کا۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں بیگم پلی تھی۔ روزے بھی تھے، نمازیں بھی تھیں، حج اور زکوٰۃ بھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ چھپ کر رنڈی بازی اور حرام کاری تھی۔ دنیا کی نظر سے چھپا کر جو عیب کیے جائیں اس سے اور کوئی نہیں مگر اولاد تو واقف رہتی ہی ہے۔ حضور اعلیٰ کی کتنی بیویاں، باندیاں، داشتائیں تھیں۔ کیا کسکو

خوش رکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی ؟ مگر سب ہی زندہ تھیں اور انسان تھیں ۔ صاحبزادیوں کی بھی شادیاں نہیں ہوئیں۔ کیا وہ سب کے سب کنواری تھیں ؟ جو اس بڑھاپے میں سال میں کتنے ہی بچے ہوتے تھے، کیا ان کی ماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کے باپوں کا پتہ نہیں معلوم تھا ؟

یہ اعلیٰ حضرت کی دانش مندی تھی یا پیدائشی کنجوسی کہ حال ہی میں اسٹیٹ گزٹ میں اعلان فرما دیا کہ اب ہم بہت ضعیف ہو چکے ہیں، لہٰذا آئندہ محل میں جو بچے پیدا ہوں وہ ہمارے نہ تصوّر کئے جائیں۔

جاگیرداری نظام کی تمام لعنتیں سوئی پڑی تھیں۔ فاقوں اور غربت نے انھیں رگوں میں پھر زندہ کر دیا۔ اگر بیگم درمیانہ طبقے کی کمزوریوں میں جکڑی ہوتیں تو بجائے بیٹی کا سودا کرنے کے سلائی کر کے پیٹ پالتیں۔ لڑکی کو کسی اسکول میں چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی۔ روکھی سوکھی میں گزر کرتیں تو زیور ہی کئی سال ساتھ دے جاتے، مگر تنگی ترشی کی نہ تو انھیں عادت تھی اور نہ ہی کبھی کسی کو کرتے دیکھا۔ ہاں لڑکیوں کے سودے تو پشتوں سے ہوتے چلے آئے تھے۔ ان کی جوان خالہ بوڑھے پھونس نواب قمرالدین کو پیسے کی خاطر بیاہی گئیں۔ کھلے بندوں ان کا سول سرجن صاحب سے تعلق تھا۔ خود ان کی بڑی کے شوہر نے ایک میم سے شادی کر لی تھی۔ اس کا غم وہ ایک شاعر کی آغوش میں غلط کرتی تھیں۔ عزت اور شرافت کا پیمانہ تھا دولت اور مرتبہ !

تو پھر وہ کون سا ایسا پاپ کر رہی تھیں جو انھیں ندامت ہوتی۔ پھر بمبئی میں کون پوچھتا ہے کہ تم کون ہو ؟ کیا ذریعۂ معاش ہے ؟ کون اپنے گریبان

میں منہ ڈال کر کہہ سکتا ہے کہ وہ اچھوتا انسان ہے، جس نے کبھی کوٹلوں کی دلالی نہیں کی!

بیگم کو معلوم تھا نیلوفر چھپ کر منوہر سے ملتی ہے۔ اسے لیے لیے پھرتی ہے۔ اس پر پیسے خرچ کرتی ہے۔ ڈھلتی عمر میں اگر اسے یہ لت ہو جاتی تو ایک بات بھی تھی، مگر چڑھتی جوانی میں تو کسی کو یوں بچوں کے ساتھ کھیلتے نہیں دیکھا۔

جب وہ اندر سے کمر بند باندھتی نکلی تو انھوں نے پھر اس کی ٹانگ لی۔

"منوہر سے شادی کر لوں گی۔"

جیسے بیگم کو سانپ نے ڈس لیا۔

"شادی کرو گی ۔ اور کھاؤ گی کیا؟ اس کے باوا کا سر؟ کچھ دماغ خراب ہوا ہے!"

گھنٹوں چخ چخ ہوتی رہی۔ بیگم روئیں، پھر نیلوفر روئی، پھر بیگم کے آنسو جیت گئے اور نیلوفر نے وعدہ کر لیا کہ اب وہ منوہر سے نہیں ملے۔ مگر بیگم کے دل میں دگدا لگا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں اپنی سوجی ہوئی داڑھ کے لیے دوا لینے گئیں تو وہیں اشارتاً کہہ دیا:

"بچہ آپ کا پڑھتا لکھتا نہیں، میری لڑکی کا بھی وقت خراب کرتا ہے۔ کچھ کیجیے۔" اور انھوں نے اسے شولاپور پارسل کر دیا۔

نیلوفر منہ پھلائے، دروازہ بند کیے پڑی رہی۔ احمد بھائی بھنڈی بازار سے نان کباب لے کر آئے مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ اتفاق سے اس دن بھولے بھٹکے احسان صاحب بھی آ نکلے۔ احمد بھائی کو دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹنے والے

تھے، مگر پکڑے گئے۔

احمد بھائی جلے ہوئے تو تھے ہی، تھوڑی دیر میں ہی دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگی، مگر کھل کر نہیں۔ جب بیگم اٹھ کر اِدھر اُدھر جائیں، وہ فوراً الجھنے لگتے:

"تم ہمارے کو کس لفڑے میں پھنسایا سالہ۔ اِدھر پکچر میں ڈبہ گول کیا، اُدھر..."

"بات کیا ہے سیٹھ؟ حکیم جی کے پاس پھر گئے تھے؟"

"گولی مارو سالہ حکیم کو۔ ادھی ہم کو لوٹا۔ تم سالہ سب چور ہے۔"

"دیکھو میاں لڑکی دو باتوں سے رام ہوتی ہے۔ دونوں کا پترا ہو جائے تو..."

"تم کیا بولتا؟ ہم کچھ نہیں سمجھا۔"

"صاف بات سننا چاہتے ہو تو بھئی لڑکی کو یا تو پیار دو کہ تمہارے لیے دیوانی ہو جائے یا کپڑا لتّا، زیور۔"

"پیار ہم تھوڑا کیا؟" احمد بھائی کا گلا بھر آیا۔

"مگر ادھر کئی مہینے سے تم نے ہاتھ دبا رکھا ہے۔ بیگم بڑی پریشان ہیں۔ سنا ہے رگھوناتھ سے زیور پر روپیہ لے کر بچّوں کو بھیجا۔ رگھوناتھ کے چنگل سے زیور نکلنا آسان نہیں۔"

"سالہ تم ہم کو کیا سمجھتا ہے؟ ہم پیسہ دیوے اور چھوکری ہم کو لات مارے۔"

اتنے میں بیگم آگئیں غسل خانے سے، فوراً احسان صاحب ہانکنے لگے:

"سی، پی، سی۔ آئی کے جواہر لال ستّر دے رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا لاکھ سے کم نہ ہوگا۔ غرض پڑے پکچر لو ورنہ مجھے ڈسٹری بیوٹر کا توڑا نہیں۔ اصل میں خود اپنا ڈسٹری بیوشن آفس کھولنے کا ارادہ ہے۔ سورج مل سے میری بات ہو چکی ہے۔"

احمد بھائی کا خون کھول رہا تھا۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا، بیگم کو بھی معلوم تھا، احسان صاحب سو فی صدی ہانک رہے ہیں۔ اس وقت ان کی جیب میں دو پیالی چائے کے پیسے مشکل سے نکلیں گے۔ لوکل ٹرین کا پاس بنوالیا ہے، اسی کا رعب جھاڑتے پھرتے ہیں۔ بار بار جیب سے رومال کے ساتھ فرسٹ کلاس کا پاس نکل آتا ہے۔ ہر مہینے بڑی چال سے ری نیو کرا لیتے ہیں۔

"ارے بھائی ذرا پندرہ روپے دینا، میرے پاس کی ڈیٹ نکلی جارہی ہے۔"

اتنی بڑی انڈسٹری ہے، اور کوئی نہیں تو وہ غریب ایکسٹرا ہی پندرہ روپیہ دے مرتا ہے جسے یہ فلم میں رننگ رول دینے کا پکا وعدہ کر چکے ہیں۔ اور بھی کون جانے یہ پروڈیوسر کی ذات بڑی پر اسرار ہوتی ہے۔ آج کوڑی کوڑی کو محتاج در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، کل کوئی اپنا بلیک کا پیسہ وہائٹ کرنے والا مل جائے، یا کسی ہیرو یا ہیروئن کو رحم آجائے اور وہ گارنٹی دے دے۔ پھر کھٹ سے کھڑے ہو جائیں۔ جیسے نیم مردہ چوہیا کو گوبر سنگھاؤ تو جی اٹھتی ہے، بالکل انھیں بھی کسی بھولے بھٹکے سہارے کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ کتنی بار مرے ہیں اور کتنی بار جی اٹھے ہیں۔ اگر بیوی نہ بھاگتیں تو بے چارے یوں ننگے نہ ہو جاتے۔

بیگم چائے کی پتی لینے پڑوس گئیں تو پھر احمد بھائی گرجے:

"کیا بکواس لگائے ہو جی۔ ہم سب جانتا۔ سورج مل سالہ ایک دم موالی!"

"موالی ہے سیٹھ، مگر دل کا چھوٹا نہیں۔"

"دیکھو ہم بول دیا۔ ہم ایک کوڑی کا دیوال نہیں۔ چھوکری ہمارے سے بات نہیں کرتا۔"

احسان صاحب نے عجیب انداز سے قہقہہ لگایا کہ احمد بھائی کے پسینے چھوٹ گئے۔

"کیا سالہ تم بکا چار سو بیس ہے۔ ہمارے کو ..."

بیگم بچی لے کر آگئیں تو جلدی سے احسان بولے:

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ذرا ابرار علوی کے ساتھ کہانی پر بیٹھنا ہے۔" عموماً وہ جو منھ میں آتا کہہ جاتے تھے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کل وہ بیدی کے ساتھ کہانی پر بیٹھ رہے تھے۔ آج ذہن سے اتر گیا تو علوی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بیگم جانتی تھیں سب کچھ، مگر انھیں کیا ضرورت پڑی تھی کریدنے کی۔ وہ حال ہی میں بار بار کہہ رہے تھے:

نیلو فرکیسی رہے گی ڈانسر کے رول میں؟" بیگم بھی سوچتی تھیں: لڑکی کو فلم میں کام مل جائے تو یہ دلدّر دُور ہو جائے۔ انڈسٹری والوں نے تو انھیں جیسے ہمیشہ ورہی سمجھ لیا تھا۔ جب سے احمد بھائی نے ہاتھ کھینچا تھا، سسک سسک کر دن بتے تھے، وہ اسٹوڈیو کے چکّر لگانے لگی تھیں۔

بچی کو تو بس آپ کی فلم میں کام کرنے کا شوق ہے۔ پیسے کی اسے بالکل پرواہ نہیں۔ اس دن محبوب صاحب کا آدمی آیا تھا کہ بلایا ہے۔ رنگ رول ہے۔ کہنے لگی: نہیں۔ وہاں گم گم ہے۔ اے میں کہتی ہوں گم گم بھی کوئی ڈانسر ہے؟ توبہ! آپ نے بے بی کا ڈانس نہیں دیکھا۔ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ آئیے نا ہمارے ہاں ایک دن۔" بیگم اٹھلاتیں اور بے چارہ نیا پروڈیوسر پھول جاتا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ بیگم سو فیصدی مسکہ مارتی ہے۔ اگر اس کی

بیبی کو رول دے دیا تو دو تین دن کی شوٹنگ کے بعد ہی پر نکالنے لگے گی۔
بے چارہ پروڈیوسر مفت کام کے رگڑے میں اگر ادھر ادھر اس پر خرچ کرنے لگتا ہے۔ مفت کام کر رہی ہے، چلو کیا حرج ہے اگر پانچ چھ لسی کے گلاس، آملیٹ اور توس ناشتے میں بیگم کے دوست کھا پی لیتے ہیں۔ کھانا وہ صرف کوالٹی سے مرغی آئے جب ہی کھا سکتی ہے۔ ساتھ ٹمکر گدے تو ان لوگوں کے لگے ہی رہتے ہیں۔ مفت کام کر رہی ہے، کپڑے بھی فلم میں اپنے ہی پہنے گی، تو کیا ہوا جو دو چار سی کے کپڑے بنوا دیے ؟

دو ساڑھیاں لکھنؤ کی چکن کی بیگم کو پسند آگئیں۔ چلو دلوا دو، دس پندرہ ہزار دینا پڑتے اگر اس جگہ کوئی دوسری ڈانسر ہوتی۔ یو۔ پی، دلی والا کہتا تھا، پدمنی کو لیجئے۔ آج ذرا بنلو فر کے گھر دعوت ہو جائے۔ دو چار بوتلوں کا ہی خرچہ ہے نا! بزنس تو پھر پکی سمجھو۔ کسی کو کیا معلوم کن کن راہوں سے گذرنا پڑتا ہے ان چھوٹے چھوٹے چھابڑی ڈھونے والوں کو۔ انھیں جان بوجھ کر مکھی نگلنا پڑتی ہے۔ مثلاً وہ جانتے ہیں کہ بیگم کے فیلے کے مفت کام کرنے والے اور بھی مہنگے پڑیں گے۔ کیوں کہ بیگم جو کچھ لیں گی اس کی رسید تو دیں گی نہیں۔ اور جب گنتی یوٹی شروع ہو جائے گی پھر یہی بیگم جو آج دوڑ دوڑ کر آتی ہیں، دو گھنٹے بٹھائیں گی، تب کہیں بات کرنے کو آئیں گی۔

"بی بی کا جی اچھا نہیں۔" اور تب تک بیبی کا جی اچھا نہ ہو گا جب تک ہزار پانچ سو ان کے اوپر نہ چڑھائے جائیں گے۔ چڑھا والے کر بھی وہ نخرے کریں گی :

"مفت گیسٹ آرٹسٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں ہم۔"

مگر دوسرے پروڈیوسروں سے کہیں گی:

"اے ہے پندرہ ہزار دیے ہیں۔ میری بیبی تو ان ردیوں کو جوتی کی نوک سے بھی نہیں چھوتی۔ مگر کیا کروں، پیچھے پڑ گئے: بس یہ رول تو تمہارے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ پھر کرنا پڑا۔ ورنہ ویل رائے تو اسے کشور کمار کے ساتھ لے رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا: مجھے کشور کمار بالکل نہیں بھاتا۔ کیا بندر کی طرح اچھلتا ہے ...."

کتنی مزے کی بات ہے کہ جھوٹ ہانکنے والا جانتا ہے سننے والے کو علم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ پھر بھی یہ جھوٹ بیوپار کے ہتھکنڈے ہیں۔ آدھی کامیابی تو اس آرٹ کے بدولت ہی مل جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اب لوگ یہ بھی جان گئے تھے کہ بیگم نیلوفر کے عاشقوں کو جلانے کے لیے ہی یوں مفت کام کرواتی ہیں، تاکہ اگر احمد بھائی آئیں اور نیلوفر نہ ملنا چاہے تو کہہ سکیں:

"بھئی فلمستان کا پروڈکشن مینیجر آیا تھا۔ شورلیٹ لے کر۔ جالان سیٹھ کے ہاں پارٹی ہے۔" یا "پرکاش کی کلر فلم کا آرٹ ڈائرکٹر آیا تھا، کچھ ساڑھیاں خریدنا ہیں بیبی کی پسند کی۔"

نیلوفر نے ایسی کئی فلموں میں کام شروع کیا۔ احمد بھائی جنت ہو گئے اور بیگم نے فوراً پروڈیوسر سے جھگڑا کر کے کام چھوڑ دیا۔ جب تک احمد بھائی چالو تھے وہ مفت کا کام کیسے کرتیں؛ گزر کہاں سے ہوتی؟

مگر احمد بھائی کہاں تک چلتے؟ ان کے سسر ریس میں پانچ لاکھ کھو بیٹھے ایک ہی دن میں برسوں کی کمائی چلی گئی۔ ادھر احمد بھائی کو دیوالیہ قرار دینے والے بھی چوکنے ہو کر ٹوٹ پڑے۔ کلابہ اور باندرہ کے جنرل اسٹور پہ تالہ پڑ گیا۔ نیلوفر والے فلیٹ پر بھی تاریخ آ گئی۔

بیگم کے چھکے چھوٹ گئے۔ بچے بھی گرمیوں کی پندرہ دن کی چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے۔ انھیں واپس بھجوانے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور اس وقت، جب قیامت کا منظر تھا، نیلوفر ہنس رہی تھی۔ چاکولیٹ منھ میں ڈال کر، بچّی کی چھوٹی سی ٹوپی انگلی پر چڑھائے، اپنے ڈریسنگ گاؤن کی بیلٹ کا لبادہ اڑھائے، گڑیا بنا کر کھیل رہی تھی۔

جب پلش کا فرنیچر گھسیٹا جانے لگا تو بیگم نے جھٹ سے زیور کی پوٹلی ساڑھی کے پلو میں باندھ کر اندر پیٹی کوٹ میں لٹکا دی اور نیلوفر کو کوسنے لگیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ پچھم کی اوٹ سے دروازہ کھلا۔ احسان صاحب مع سورج مل کے غیب سے ظاہر ہوئے۔

دیکھتے دیکھتے فلیٹ کی قیمت مع فرنیچر وغیرہ کے ادا کر دی۔ کاغذات بیگم کی گود میں ڈال دیے۔ اور نیلوفر کی اس سڈول پنڈلی کی طرف بھی نہ دیکھا جو نیلے ڈریسنگ گاؤن سے بادلوں میں بجلی کی طرح کوندرہی تھی۔

سورج مل کنوڈیا نو دو لیتے نہیں تھے۔ ان کے دادا کی آٹے دال کی دکانیں کلکتہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چاولوں میں سفید کنکر ملانے کا فن شاید انھیں نے ایجاد کیا تھا۔ دال میں بڑے کنکر ملانے میں کئی فائدے ہیں: ایک

تو چلنے والی گرہستن کی آنکھیں نہیں پھوٹتیں ، دوسرے ان کے ملے رہ جانے کا بھی خطرہ نہیں ۔ چندھوں کو بھی نظر آجاتے ہیں ۔ آٹے میں سفید لکڑی کا برادہ ملا دینے سے کسی پر مصیبت نہیں آتی ۔ لکڑی بھی ایک قسم کی ترکاری ہے ۔ وہ بہ برادہ خاص طور پر جاپان سے امپورٹ کیا کرتے ۔ سندہ گھی میں اگر سیر پیچھے چھٹانک چربی ملا دی جائے تو بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچتا ۔ چربی بھی جانور کی چکنائی ہے ۔ برابر فائدہ مند ہے ۔ ہلدی میں ٹیسو کے پھول اگر پیس کر ملا دیے جائیں تو فائدہ ہی ہے، گرمی کم ہو جاتی ہے ۔ دھنیے کی گرمی نکال کر اگر بھوسا پسوا کر الگ بیچا جائے یا الائچیوں میں سے تھوڑا سا ست نکال لیا جائے تو کوئی ٹوٹا نہیں آتا ۔ ویسے بڑے سادھو منش تھے ۔ کتنے ہی آشرم انکے دان پر چلتے تھے ۔

سورج مل گریجویٹ تھے ۔ فیشن ایبل تھے ۔ ان کی بیوی ایف، اے پاس ۔ ناچ گانے میں طاق، بڑی حسین عورت تھیں ۔ چار بچے تھے ۔ بڑے پیار کی زندگی تھی ۔ مگر منھ کا مزہ بدلنے کے لیے وہ دو چار لڑکیاں رکھا کرتے تھے ۔ بزنس میں بڑی سہولت رہتی ہے ۔ یار دوستوں کو گھر میں شراب پلانا انھیں قطعی پسند نہ تھا ۔ خاص طور جب سے پروہبشن شروع ہوا تھا ۔ اصل ہو حق تو وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ہی کر سکتے تھے ۔ نیلو فر عرصے سے ان کے پلان میں تھی ۔ وہ اسے بہت اونچے اور ٹھاٹ دار طریقے پر رکھنا چاہتے تھے ۔ احمد بھائی لیچڑ انسان تھا، ہر بات سنسک کر کیا کرتا تھا ۔

سورج مل کچھ روپیہ فلموں میں لگانا چاہتے تھے، مگر جن شرائط پر وہ

روپیہ لگانا چاہتے تھے، بڑے پروڈیوسر تیار نہ تھے ساٹھ فی صدی سالانہ سود کون دے سکتا تھا؟ اتنا سود وہ، آرٹسٹوں کی بلیک بھرو، میوزک ڈائرکٹر بھی بلیک ہی زیادہ مانگتے ہیں۔ دس لاکھ کی فلم بناؤ، دو لاکھ سود کے چار لاکھ بلیک کے، رہ گئے چار لاکھ، تو اس میں ہے ساری فلم بنائی جائے۔ چار لاکھ کی فلم کو دس لاکھ کی ظاہر کرنا وہ فن ہے جو ٹکے والے پروڈیوسر ہی جانتے ہیں۔

احسان صاحب بھی اسی قسم ایک کے پروڈیوسر تھے، جنھیں پاکر سورج مل کنوڈیا کو یقین ہو گیا کہ اب محبوب، شانتارام اور بمل رائے کا زمانہ ختم ہو گیا ایس مکرجی کا راج ختم، اب تو بس سورج مل فلم پروڈکشن کا ہی بول بالا ہوگا۔ انھیں دادر کا فلیٹ قطعی ناپسند تھا اس لیے انھوں نے اے روڈ، چرچ گیٹ پر اونرشپ پر فلیٹ لے کر سارے خاندان کو اس میں انڈیل دیا۔ ایک موٹر میں آ نہیں سکتے تھے، اس لیے ایک موٹر ڈرائیور چلا کر لایا۔ جاتے وقت وہ ایک گاڑی چھوڑ گئے، صبح ایک ڈرائیور بھجوا دیا۔

مگر سورج مل دوسری قسم کے انسان تھے انھیں نیلوفر کی مستی اداؤں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ابھی تک اسے ہاتھ لگانے کی بھی خواہش نہیں ہوئی تھی وہ اسے ڈھیل دینا چاہتے تھے۔ کبھی کبھار گال پر چٹکی لے لیتے، کبھی کولھے پر دھپ مار دیتے۔ اس سے بلند مرتبہ ابھی اسے دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ تھی بھی ذرا گنوار۔ احمد بھائی کی صحبت میں بہت ہی بھونڈاپن آ گیا تھا۔ ایک دم بمبئی کی گلیاری زبان پر اتر آتی۔ موالیوں کی طرح اکڑ کر دیکھتی، گو یا کہہ رہی ہو: "میلوں نہ مانو گے۔ پھر ہو جاؤں ننگی؟"

مگر سورج مل اس کی برہنگی سے قطعی مسحور نہ ہوئے۔ کم از کم ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کی اصل بات جو انھیں پسند تھی، وہ اس کا شریف خون تھا۔ وہ سارے ہندوستان کی تہذیب کا لطف اٹھا چکے تھے۔ انھیں عورت میں بڑے گنوں کی تلاش تھی، جو انھیں دلّی، آگرہ اور بنارس کے اونچے کوٹھوں میں ملے تھے۔ بڑی خوبصورت اردو بولتے تھے۔ بمبئی کی بولی پر کبیدہ خاطر ہو جایا کرتے تھے۔

نیلوفر کو پہلے تو ان سے گھن آئی، پھر ٹھیک لگنے لگے۔ وہ انھیں لبھانے کے لیے ایک دم شرافت پر اتر آئی۔ سلیقے سے کپڑے پہننے لگی۔ ڈریسنگ گاؤن میں اسے دیکھ کر وہ گھبرا کر دو چار بار لوٹ گئے تو وہ ان کے آنے سے پہلے کپڑے پہن کر تیار بیٹھنے لگی۔

وہ اسے آزادی سے ساتھ لے جانے لگے۔ ذرا شوقین لوگوں کی دعوتوں میں، پکنکوں اور گانے بجانے کے پروگراموں میں، کلبوں میں بھی وہ ساتھ رہنے لگی۔ گو اسے معلوم تھا: اس کی طرح تین اور لڑکیاں ہیں، جن سے سیٹھ کی اولاد بھی ہے، مگر وہ سب نہایت شرافت سے رہتی ہیں۔ ان کے بچے انگریزی اسکولوں میں جاتے ہیں۔ جس محلّے میں رہتی ہیں سیٹھ کی بیوی سمجھی جاتی ہیں۔ سیٹھ ہنگامے کے قائل نہیں۔ چپ چاپ آتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ یار دوست بھی آتے ہیں۔ مصلحت دیکھتے ہیں تو کسی دوست کو داشتہ ادھار بھی دے دیتے ہیں۔ اگر دوست چاہے تو بالکل ہی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ مع خاندان کے اس کے ہاتھ فلیٹ بیچ بھی دیتے ہیں۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنے خاندانوں کا خرچ کیوں کر برداشت کرتے ہیں؟

بڑی لمبی چوڑی بیوپاری تفصیل ہے۔ خیر جہاں اتنی تفصیل جھیلی ہے، یہ بھی برداشت کر لیجیے، شاید کوئی کام کا نکتہ ہاتھ آجائے۔

سیٹھ ان لڑکیوں کے نام سے بزنس کرتے ہیں۔ ان میں اتنی عقل تو ہے نہیں کر کچھ سمجھیں یا شبہ کریں۔ وہ جن کاغذات پر دستخط لیتے ہیں یہ کر دیتی ہیں، اور انھیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ لاکھوں کا لین دین کر رہی ہیں۔ انکے نام سے ٹھیکے لیتے ہیں، لیکن سب قانونی حدوں کے اندر۔ جتنا اس طریقے سے انکم ٹیکس، سپر ٹیکس سے بچ جاتا ہے، وہ ان کے خرچ سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

نیلوفر چونکہ پڑھی لکھی تھی، اسے معلوم ہو گیا کہ احسان صاحب کو جو فلم کے لیے روپیہ دے رہے ہیں وہ اس کی طرف سے ہے۔ وہ کمپنی کی مالک ہے اگر اس کے دل میں بے ایمانی آجائے تو سیٹھ منھ دیکھتے رہ جائیں۔

اپنی طاقت کا اندازہ کر کے وہ ایک دن پھول گئی۔ بیگم کو اس نے سمجھایا تو ان کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ خیر بیچ میں جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟ نیک آدمی ہے۔ اپنا بھی تو فائدہ ہی ہے کسی بات کی کمی نہیں، بیگم سمجھدار تھیں۔

نیلوفر کو انھوں نے آہستہ آہستہ رانی صاحبہ کہلوانا شروع کر دیا۔ سیٹھ مسکرا کر رہ گئے۔ ان کی سب ہی عورتیں اپنے اپنے محلوں میں رانیاں بنی ہوئی تھیں، مگر ایک دوسری سے واقفیت نہ تھی اور صرف اپنے ہی کو رانی سمجھتی تھیں۔

جب خبر سے نیلوفر کا پیر بھاری ہوا تو سیٹھ ایسے خوش ہوئے جیسے ہیجڑے کے گھر بیٹا ہونے کی خبر ملی ہو۔ خود لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اپنے ہاتھوں سے ٹانک اور وِٹامن کھلاتے۔ ہر وقت احتیاط رکھنے کو کہتے۔

مگر جس دن فلم کی مہورت ہوئی تو سیٹھ نے پوجا کرتے وقت صرف اپنی بیوی کو ساتھ بٹھایا۔ نیلوفر کا جی اچھا نہ تھا، مگر وہ ضد کر کے گئی اور جب وہ پوجا کر رہے تھے تو ساتھ بیٹھنے پر اڑ گئی۔

"واہ! میں اصل پروڈیوسر ہوں، میرے ساتھ مہورت ہوگی۔"

"پیسہ تو سیٹھ کا ہے، ان کی خوشی ہو جانے دو۔" احسان صاحب نے کہا۔

"اے ایسا بھی کیا چھچھورپن۔" بیگم نے بھی ڈانٹا۔

تصویر کھنچنے لگی تو وہ بھی ساتھ ڈٹ گئی، لیکن عین وقت پر اس کے اور سیٹھ کے درمیان احسان صاحب گھس آئے۔ وہ ہر کھنچتی ہوئی تصویر میں گھستی، مگر ذرا سی ترتیب بدل کر پھر کونے میں جا پڑتی۔

جب تصویریں اخبار میں چھپیں تو اس کا نام بھی یونہی کہیں اڑا دیا اور ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ آگیا۔ حسبِ عادت اس نے دوسرے دن ~~اس نے~~ سیٹھ سے الجھنے کی کوشش کی تو انھوں نے پہلے تو ہاتھ سے ایک خوراک ٹانک کی پلائی، پھر بڑی نرمی سے سمجھایا: "یہ سب بزنس کی باتیں ہیں۔ بے کار عورتوں کو ٹانگ نہیں پھنسانا چاہیے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گی تو ایسی فضول کی باتیں نہیں کرو گی۔"

مگر نیلوفر رانی بن چکی تھی۔ اسے چین نہ پڑتا۔ خواہ کتنی بھی تکلیف ہوتی وہ شوٹنگ پر جاتی۔ ہر بات میں بال کی کھال نکالتی:

"یہ اتنا وقت کیوں خراب ہوتا ہے؟"

"پروڈکشن مینیجر چور ہے۔"

"یہ گانا چلتا ہوا نہیں ہے۔"

"یہ ہیروئن بلیک کیوں لیتی ہے؟ ہیرو دو بجے کیوں آتا ہے؟ سب کام چور ہیں۔"

بیگم بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتیں، دونوں مل کر ہر ایک سے الجھتیں لوگ منہ پر تو کچھ نہ کہتے، بیٹھ پیچھے گالیاں دیتے۔

جب نیلوفر نے بھونڈی سی لونڈیا جنی تو سیٹھ کا منہ سوکھ گیا۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کی سب داشتاؤں کے پہلوٹھی کے بیٹے ہی ہوئے تھے۔ ان کی اصلی بیوی کے بھی تین لڑکے ہی تھے۔ صرف ایک لڑکی تھی، جس کے لیے وہ چند لاکھ میں آسانی سے بر خرید سکتے تھے، حالانکہ وہ تو نیلوفر کی لڑکی سے بھی زیادہ بدصورت تھی۔

لڑکی کی پیدائش پر کچھ بیزار سے ہو گئے۔ مشغولیت بھی بڑھ گئی۔ اڑتی اڑتی یہ بھی خبر ملی کہ پنجاب سے کوئی بڑی دھاڑ دار لڑکی آئی ہے، سیٹھ آج کل اس کے ساتھ بہت گھومتے ہیں۔ اس نے سیٹھ سے لڑنے کی کوشش کی تو وہ ہنس کر ٹال گئے:

"ارے بھئی بے چاری کام کی تلاش میں ہے۔ احسان میاں سے میں نے

کوئی چھوٹا سا رول ہو تو اسے دے دو۔"

"پکچر ختم ہو گئی، اب رول کہاں دھرے ہیں؟" بیگم بولیں۔

"وہ ایک کیمپ میں ڈانس رہ گیا تھا۔" احسان بولے

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ اب کچھ باقی نہیں۔"

"ڈسٹری بیوٹر نے کہا ہے ایک اور ڈانس ڈالو۔"

"ارے تم سمجھتی تو ہو نہیں، بے کار لڑنے لگتی ہو۔" احسان صاحب نے خلاف عادت ذرا گرمی سے کہا۔

"اور آپ بہت سمجھتے ہیں؟ چپکے بیٹھے رہیے۔ میرا منہ نہ کھلوائیے۔ رنڈیوں کی دلالی کرتے ہیں اور اوپر سے اکڑ دکھاتے ہیں۔"

"جانے دو ان باتوں سے کیا فائدہ؟" سیٹھ نرمی سے بولے۔

"کیوں جانے دوں؟"

"احسان میاں آپ ہی چپ ہو جائیے۔"

"میں تو چپ ہوں سیٹھ جی۔ ان کتیوں کے منہ آنا اپنی عزت گنوانا ہے"

"کتیا ہوں گی آپ کی امی جان۔" نیلوفر آپے سے باہر ہو گئی۔ وہی نیلوفر جس کی سوا چار سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی تھی۔ جو تتلا کر گایا کرتی تھی: "لب پہ آتی ہے دعا..." تو دادی بی اس پر سے صدقہ اتارا کرتی تھیں، جسے ساتوں کلمے ازبر تھے، جو سلام پڑھتی تھی تو لوگوں کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہی اب کھلی کھلی گالیاں دینے میں مچھلی والیوں کو بھی مات کر رہی تھی۔

احسان صاحب بھی کچھ کم نہیں تھے۔ ان کی گالیوں میں پھیلاؤ بھی تھا اور گہرائی تھی۔ مگر سیٹھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ وہ اس وقت تک مسکراتے رہے جب تک اونچی ایڑی کی سینڈل بے کر نیلوفر نے احسان صاحب کی نکسیر چھڑا دی۔ وہ تو اسی وقت پولیس چوکی جانے کی دھمکی دے رہے تھے سیٹھ نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن تک سیٹھ نہیں آئے۔ نیلوفر نے کتنی بار فون کیا، معلوم ہوا نہیں ہیں، یا سو رہے ہیں۔ بہت پیچھے پڑی تو ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ مگر روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مہینے کا خرچ اسی طرح اٹھائیس تاریخ کو چیک کی صورت میں مل گیا آج پہلی بار رسید پر دستخط کرتے وقت نیلوفر نے دیکھا کہ رسید پر روپیہ کی وصولی کا حوالہ ہے۔ آج تک جتنا روپیہ اسے ملا تھا، سب ایسے ہی ملا تھا۔ اگر سیٹھ چاہیں تو یہ روپیہ واپس لے سکتے ہیں۔ یہ روپیہ اس نے فلم بنانے کے لیے لیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی وہ نہ جانے کتنی رسیدیں اسی طرح وقتاً فوقتاً دیتی رہی تھی۔ کچھ سادی ہنڈیاں بھی دستخط کر کے دی تھیں۔ مکان بے شک اس کے نام تھا۔ اس کے علاوہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم کا زیور نہ ہوگا۔ بیگم بدحواس ہو گئیں۔ کمبخت نے بے کار بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔

نیلوفر نے رسید پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ سیٹھ نے کچھ نہ کہا، مگر چوتھے روز چیک واپس آ گیا۔

اے روڈ کی پُرشور فضا میں کسی نے وہ کوسنے گالیاں نہیں سنیں جو نیلوفر اور بیگم کی جنگ کے دوران میں دی اور لی گئیں۔ نہ ہی ان جوتوں کی پھٹا پھٹ سنائی دی جو ایک دوسرے کے سر پر ماری گئیں۔ اور نہ ہی کسی کے کان پر جوں رینگی، جب وہ رو دھو کر گلے مل گئیں۔

بیگم نے سیدھے جا کر احسان کے پیر تھام لیے۔ وہ بھی کچھ پریشان سے بیٹھے تھے، من گئے۔ پھر دونوں سیٹھ کے پاس گئے۔ گھر پر بزنس کے سلسلے میں کبھی کسی سے نہیں ملتے۔ دفتر میں کئی گھنٹے انتظار کے بعد سیٹھ ملے۔ بالکل ڈیرے دار طوائفوں کی نائیکاؤں کی طرح انھوں نے سیٹھ کو یقین دلایا کہ ان کے فراق میں نیلوفر ایک دم لب دم ہو رہی ہے۔ رو رو کر بے حال ہو رہی ہے۔ اگر وہ نہیں آئے تو جان دے دے گی۔

سیٹھ بھی واقعی شری کھنڈ کے بنے ہوئے تھے، فوراً بڑے پیار سے بولے:
"فرصت نہیں ملی۔ پکچر کی ڈلیوری دینا ہے۔ پوچھ لیجیے میاں سے، دم لینے کا دار نہیں۔ کمبخت مدراس والا بہت تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے اتنی لیٹ کر دی پکچر۔" اور وہ کاروباری مشکلات کی تفصیلوں میں چلے گئے۔

اتنے میں وہی پنجاب کی نوخیز کلی لجائی شرمائی آگئی۔ آج پریمیر پر جانا تھا کسی فلم کے۔ نیلوفر کتنے دن سے تڑپ رہی تھی اس فلم کے پریمیر پر جانے کے لیے۔ نئی ساڑی بھی خریدی تھی۔ سیٹھ ایک دم اٹھ کر اس کے ساتھ اندر کے کمرے میں گئے۔ بیگم بیٹھی سوکھتی رہیں۔ معلوم ہوا وہ تو ادھر ہی سے نکل گئے۔

"میں نہ کہتا تھا سیٹھ ایک حرامی ہے۔ ایک دفعہ کسی بات کا فیصلہ کر لے تو پھر کوئی چیز اسے بدل نہیں سکتی۔ اب نیلوفر میں وہ دم خم بھی نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" بیگم بن کر چونکیں۔ انھیں کیا نیلوفر کو بھی یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ سیٹھ سورج مل احمد بھائی کی طرح کبھی اس پر لٹو نہیں ہوئے۔ پھر بھی دو سال نبھا گئے۔

اگر نیلوفر اتنی اکھڑ نہ ہوتی تو ساری عمر نبھا جاتے۔ انھوں نے کبھی کسی کو منجھدار میں نہیں چھوڑا، مگر رسید پر دستخط نہ کر کے اس نے ان کا سخت اپمان کیا۔ اور یہ وہ نہیں برداشت کر سکتے کہ ان کی نیت پر کوئی شک کرے۔ نیلوفر کو انھوں نے خود ہی معاف کر دیا۔ وہ تو احسان صاحب کی صورت دیکھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اسے ساری دنیا پر غصّہ آ رہا تھا، جو اس نے ننھی سی بچی پر اتارا:

"اس کمبخت کو بھی وہیں پھنکوا دو۔"

"اُنہہ! نہ جانے کیا ارادہ ہے اس کا؟" احسان صاحب چڑ گئے۔

"کیوں؟ میں کیوں پالوں اس حرام زادی کو؟"

"دیوانی نہ بنو۔"

"ارے میں تو ان کے چھکّے چھڑا دوں گی۔ بنیے کا بچّہ سمجھتا کیا ہے؟"

"نیلوفر بی بی۔ ہاتھی سے گنّے چھیننے چلی ہو۔ کیا سمجھا ہے تم نے؟ سیٹھ کوئی رَاگا وُڈی ہے؟ نہ جانے کس گمان میں ہو تم۔"

"مگر لڑکی سیٹھ کی ہے کہ نہیں۔ اس کا حق ہے یا نہیں؟" بیگم بولیں۔

"لڑکی سیٹھ کی ہو یا نہ ہو، اس سے بحث نہیں، مگر اس کا حق کچھ نہیں، کیونکہ قانوناً وہ ان کی نہیں۔ سیٹھ کا ایسا کوئی بچّہ بھی ان کی دولت میں حق دار نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم گدھی ہو نری۔ ہسپتال میں تم کس نام سے گئی تھیں۔"

"ہسپتال میں؟ پتہ نہیں۔ لیکن بل سارے سیٹھ جی نے چکائے۔"

"ہاں مگر بچے کے باپ کا نام ؟"

"سیٹھ جی کا ہوگا۔ اور کس کا ہو سکتا ہے ؟"

"جی نہیں، یہی تو تمہاری بھول ہے۔"

"پھر کس کا نام تھا ؟"

"اب جانے دو، کیا حاصل ان باتوں سے ؟"

"آخر بتاتے کیوں نہیں ؟"

"بھئی تم سے ڈر لگتا ہے۔ تمہارے ہاتھ پیر قابو میں، نہ زبان قابو میں۔"

"نہیں ایسی بھی کیا بات ہے، بتاؤ نا۔"

"میرا ہی نام ہے۔"

"تمہارا۔ اے کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ؟"

"اچھا تم ہی بتاؤ کیا کرتا ؟ نہ کر دیتا۔ دیکھو نیلوفر اس مار آماری سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔" انھوں نے اس کی آنکھوں میں خون اترتا دیکھ کر کہا "ٹھنڈے دل سے بات سنو، ورنہ بھئی میں چلا۔" انھوں نے دھمکی دی۔

گالیوں، کوسنوں کی معقول مقدار کے تبادلے کے بعد بولے:

"حق کی بات پوچھتی ہو تو قانوناً تم میری بیوی ہو۔" احسان صاحب نے بتایا، سیٹھ شروع سے اس لفڑے میں پڑتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس شرط پر تمہیں یہاں لائے تھے کہ میں نکاح کر لوں اور ..."

"اوئی! مردوے بھیجا لوٹ گیا ہے تیرا۔ نکاح کیسے ہو گیا ؟ یک طرفہ نکاح ہو گیا ؟"

"باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔ نکاح نامہ موجود ہے۔"

"ہیں۔ نکاح نامہ۔ وہ کیسے؟" انھوں نے نیلوفر کا ہاتھ پکڑ لیا، جو احسان صاحب پر گالیاں برساتے برساتے جوتوں پر اتر آئی تھی۔

"جعلی نکاح نامہ۔ میاں جی جیل کی ہوا کھانے کا ارادہ ہے؟"

"بیگم اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ اور بخدا میری نیت میں کھوٹ ہو تو سور کا سا منہ ہو۔"

"اب سور سے کیا کم ہے۔" نیلوفر جلے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

"نہیں تو میرا شکرگذار ہونا چاہیے کہ یہ لونڈیا بھی حرامی نہیں اور سیٹھ بھی خوش۔ قسم سے میں نے تو یہ سب کچھ اس وجہ سے کیا کہ بھئی آخر کو شریف لڑکی ہے اولاد ہو گی تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

بیگم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سخت جان ہو جانے کی وجہ سے متحیر نہ ہونے کی کچھ عادت پڑ چلی تھی، پھر بھی پوچھا:

"مگر یہ موا نکاح ہوا کیسے؟"

"اب کیسے بھی ہوا، دستخط موجود ہیں۔"

"اے ہے کیسے دستخط؟"

"صاحبزادی کے، پھر دو گواہوں کے۔"

"نہ جانے کس دھوکے سے لے لیے دستخط۔ ابھی تو اللہ جانے اور کہاں کہاں یہ دستخط نکالیں گے۔ یہ فلیٹ تو ہے بابا یہ بھی دستخطوں میں گیا؟ کتنی بار کہا نیک بخت پڑھی لکھی ہے، دیکھ تو لیا کر۔ بس آنکھ بند کی اور اپنی میت پہ دستخط

نیلوفر کا کردار ابھرتا ہے۔ جو اپنی روزی روٹی کمانے کے احساس سے ... پر انحصار بھی کرتی ہیں اور اسے برا بھلا بھی کہتی رہتی ہے۔ زبان درازی، طعن و تشنیع، گالی گلوچ سب اسی کا حصہ ہیں۔

کر دیے۔"

"ہاں یہ فلیٹ ابھی تک تو تمہارا ہی ہے، آگے سیٹھ کی مرضی۔ اگر نیلوفر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر ..."

"اب کیا ہوگا؟" بیگم حسرت سے ہاتھ ملنے لگیں۔

"ہوں تو آپ ہمارے خصم ہوئے؟" نیلوفر نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اے نیلوفر یہ کیا بدتمیزی ہے؟" بیگم جل گئیں۔ شاید اب بھی گذشتہ تعلقات کے واسطے انھیں تھوڑا سا خیال تھا۔

"ارے واہ! ہم تو اپنے میاں سے بات کر رہے ہیں۔"

"بس بس۔ زیادہ بکواس لگائی تو جوتی سے منہ مسل دوں گی۔"

"مہر کتنا ہے میاں جی؟" نیلوفر مسکرائی۔

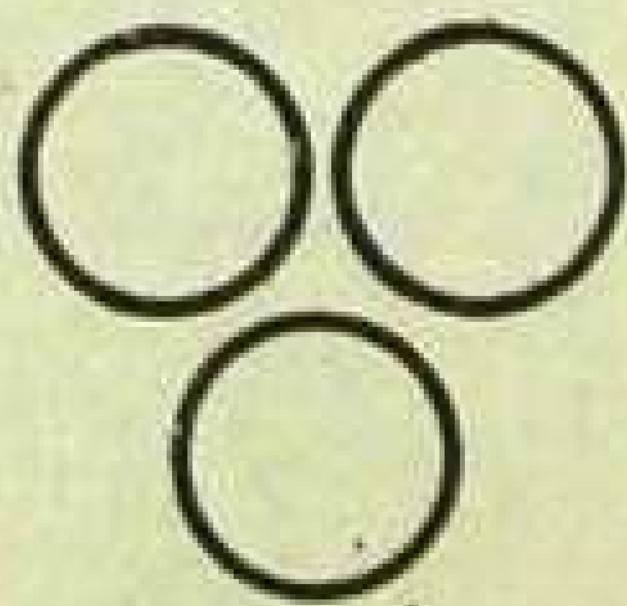
"وہی شرعی مہر مبلغ بتیس روپے۔"

"نقد۔" نیلوفر نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اے روڈ پر رہنے والے زندہ دل لوگوں نے سوچا بڑی ہنس مکھ ہے یہ قہقہوں کی رانی! نیچے مندر میں بھجن شروع ہو گئے تھے۔ سامگری کی بو باس ہوا کو بدمست بنا رہی تھی۔ ہارمونیم کی ہیں ہیں ڈھولک کی گمک اور مجیروں کے چھناکوں کے ساتھ مل کر ماحول کو جاندار بنائے ہوئے تھی۔ پجاری جی اپنی پھٹے بانس جیسی بے سری آواز میں کوئی فلمی گیت گا رہے تھے:

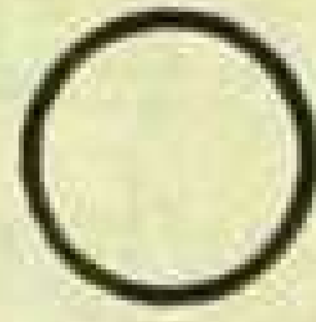
"دیوتا مجھ کو تیرا سہارا - میں نے تھاما ہے دامن تمہارا۔" یا شاید: تونے تھاما ہے دامن ہمارا۔" ہمارا؟ تمہارا؟ فلمی ٹیوں میں جو بیٹھ جائے وہی ٹھیک ہے

یہاں کسی کو پتہ نہیں کیا ہمارا ہے اور کیا تمہارا۔ خدا نے احسان کا دامن پکڑا ہے یا خدا کا دامن احسان نے پکڑ رکھا ہے۔ کچھ فرق نہیں پڑتا جس انداز سے پجاری گا رہا ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور خدا دست بہ گریباں ہیں اور بس۔ اور نیلوفر اونچے اونچے قہقہے فضا میں اچھال رہی ہے۔ کیا بھگوان کی لیلا ہے۔ اس کی ماں کا یار اس کا قانونی شوہر! قانون اور شوہر، شوہر اور قانون ـــ سب ایک سڑک کے پتھر ہیں، جن سے نیلوفر جیسی بے بس لڑکیوں کو سر پھوڑنا پڑتا ہے۔ تب ہی تو اس کے قہقہوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں اور دور بمبئی کی خواب آلود فضا میں پنجاب کی ایک نوخیز کلی ہولے ہولے پھول بن رہی ہے۔ سیٹھ کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں چیخ رہی ہیں۔ کل شگوفہ کے پہلے فلم کی مہورت ہے۔ وہی ہیروئن ہے۔ وہی اپنا پیسہ لگا رہی ہے۔ اپنا پیسہ ـــ سیٹھ کا پیسہ ـــ اپنا جسم ـــ اور سیٹھ کا جسم!

یہی پیار ہے اور یہی بیوپار!



چوتھا باب



شادی کب اور کہاں ہوئی

"مگر یہ اللہ مارا نکاح ہوا کب ؟ کہاں ہوا ؟"
"بکھیم پور میں - اس فلیٹ میں آنے سے پہلے -"
"میاں ہوش کے ناخن لیو - ہتھ کڑیاں نہ پڑوادوں تو بیگم نہیں بالزادی بولنا -"
"ہاں مقدمہ لڑو تو شاید جیت جاؤ - مگر کیا ضرورت ہے مقدمے کی ؟ چاہو تو آج طلاق لے لو - میں نے تو تمہارے ہی بھلے کو کیا تھا -"
"ایسی کی تیسی میرے بھلے کی -"
"ہاں جی طلاق دے دو -"
"سوچ لو ٹھنڈے دل سے -" احسان صاحب مسکرائے -
"کیا سوچ لوں ؟"
"ممکن ہے سیٹھ پھر من جائے - ویسے وہ کبھی تھوک کر چاٹا تو نہیں کرتے بھئی میں تو اپنی سی کر چکا - اب اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں، مگر فکر نہ کرو، بچوں کی فیس ہر مہینے وقت پر پہنچ جائے گی - گھر کا خرچ بھی ملتا رہے گا -"
"مگر وہ آئے کیوں نہیں ؟ تم نے کہا ہوتا نیلو فر انھیں بہت یاد کرتی ہے -"
نیلو فر کی آواز بھرا گئی - احسان صاحب ہنس پڑے -
"کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو - موجی آدمی ہے اپنا سیٹھ - کسی سے دل

لگ جائے تو کیا کہنے، مگر ایک دفعہ منہ پھیر لے تو پھر . . . "

"اے توبہ جی۔ لڑکی سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا۔" بیگم بولیں۔

"دل کا سودا جو ہوا۔"

"ہنہ۔ حرامزادہ بڑا آیا دل والا۔" نیلوفر غرائی۔

"میں کہتا ہوں اس بکواس سے فائدہ؟ سانپ نکل گیا، تم بیٹھی لکیر پیٹ رہی ہو۔"

"لمبے سانپ کی منڈی نہ مسل دوں تو نیلوفر نہیں چھنال بولنا۔"

"کیوں بے کار میں جی کڑھا رہی ہو؟" احسان نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"اُنہہ۔ غارت ہو۔" نیلوفر نے ان کا ہاتھ دور جھٹکا۔

"بھئی واہ۔ یعنی ہم ہاتھ بھی نہ لگائیں۔"

"نہیں۔"

"وہ کیوں جی؟"

"ہمیں گھن آتی ہے۔"

تھا کہ نیلو خود دس سال سے طوائف کے پیشے سے وابستہ تھی مگر ابھی وہ بھرپور جوان تھی — کوئی پیشہ ور عورت کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اسے کوئی ڈھلتی عمر کا طعنہ دے [illegible] اور جب [illegible] جھنجھلا [illegible]

"اللہ رے دماغ! رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ اب یہ نخرے نہیں چلیں گے مس صاحب۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ دس برس ہو گئے نا اس دھندے میں۔"

"تو پھر؟"

"تیس پر عورت ڈھل جاتی ہے۔" وہ بڑھے چلے گئے۔

"اے کاہے کو طوفان جوڑتے ہو جی۔ کون ہے تیس کی؟" بیگم بیچ

میں آگئیں" چل لڑکی اپنے کمرے میں جا۔ یہ موا تو آج واہی تباہی پر تلا ہوا ہے۔"

"میں ڈھل گئی ہوں۔ یہی کہہ رہا ہے نا؟" نیلوفر کی آنکھوں میں ناگنیں پھنکارنے لگی۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں جی، وقت خود کہہ رہا ہے۔ ورنہ سیٹھ جی آج شگوفہ کے بجائے تمہارے قدموں میں ہوتے۔"

"تو میں بوڑھی ہو گئی۔ یہی مطلب ہے نا؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا، مگر ایسی نئی نویلی بھی نہیں۔"

"میں ڈھل گئی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بلاؤز تار تار کر ڈالا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ "دیکھ اندھے۔" پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس بپھرتے ہوئے طوفان کو دیکھتے رہ گئے۔ بیگم کے ہاتھ سے سلاد کی پلیٹ چھوٹ پڑی۔

"ہے ہے نامراد۔ دیوانی ہوئی ہے کیا؟ شرم نہیں آتی؟"

"نہیں آتی شرم۔" نیلوفر نے آنسوؤں بھرا قہقہہ لگایا اور جھٹکے سے بکھرے ہوئے بال پیچھے پھینک کر بالکل احسان صاحب کے سر چڑھ آئی۔

"دیکھ حرامزادے۔ میں ڈھل گئی ہوں۔ تو اب میاں کاہے کو مرگئی رہے ہو؟"

احسان صاحب سہمی ہوئی ہنسی ہنسے اور آستین سے پسینہ پونچھ ڈالا۔

"چل جا کپڑے بدل۔" بیگم نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔

"نہیں بدلتے۔" نیلوفر نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"سامنے فلیٹ میں مسٹنڈے کھڑے دیکھ رہے ہیں کمبخت۔"

"دیکھنے دو۔ دیکھو جی مجھے غصہ دلاؤ گی تو ایسی کی* ایسی سڑک پر چلی جاؤں گی۔" وہ بالکنی کی طرف مڑی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ بالکنی میں جاتی، بیگم نے دہائی ڈال دی۔ احسان صاحب کو گالیاں دینے لگیں۔ انھوں نے لپک کر کولیا بھر لی اور اسے صوفے پر بیٹھ دیا۔

اسی لئے بو [illegible] اور آنکھوں میں شعلے تھے۔ اور انھوں نے پھر احسان صاحب، بیگم، باورچی اور آیا سب کی [illegible] پرخچے اڑا دیئے۔ [illegible] کر ڈالا۔

پھر جو گھمسان ہوئی ہے تو احسان صاحب، بیگم، باورچی اور آیا ایک طرف، دوسری طرف ننگ دھڑنگ نیلوفر نے سب کی دھجیاں* بکھیر دیں۔

جتنی توڑنے کے قابل چیزیں تھیں ریزہ ریزہ کر ڈالیں، پھر جو بھی ہاتھ آیا اٹھا اٹھا کر بالکنی سے نیچے پھینکنے لگی۔

اور اسی وقت جیسے جادو کے زور سے سیٹھ سورج مل کنوڈیا کمرے میں آ گئے۔ چپ کھڑے وہ چند لمحوں تک اس آیا دھابائی* کو دیکھتے رہے، مسکراتے رہے۔

ایسے ہی وقت سیٹھ سورج مل کنوڈیا کمرے میں آ پہنچے۔ وہ اسی آیا دھابائی کو [illegible] مسکراہٹ بکھیرتے رہے۔ انھوں نے نیلوفر کا سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیا۔

"اسے چھوڑ دو۔" انھوں نے احسان صاحب کو آہستہ سے ہٹایا۔ ان کی آنکھوں میں میٹھی میٹھی آنچ سلگنے لگی۔ ابلتی چھلکتی* نیلوفر پر انھوں نے ایک منٹ میں قابو پا لیا اور وہ نیلوفر، جو ہزار نخرے کرنے کی عادی تھی، جو احمد بھائی سے دانتوں سے جوتے اٹھوایا کرتی تھی اور اپنے پیر دلوایا کرتی تھی، کٹی پتنگ کی طرح اُن* کی آغوش میں بہہ گئی۔

نیلوفر [illegible] ان کی آغوش میں [illegible]

عیاشی اس کے خون میں رچ چکی تھی۔ دس برس سے اس کی زندگی کا مقصد صرف جسمانی لذت پرستی بن چکا تھا۔ سیٹھ کی چند دنوں کی بے رخی نے اسے

دہلا کر رکھ دیا۔ سیٹھ جی نئی لڑکی کے چکر میں پھنس گئے۔ تو کیا واقعی وہ ڈھل گئی تھی؟ نہیں ۔۔ وہ اتنی ڈراؤنی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ یہ جسم ہی تو اس کا کل اثاثہ تھا۔ اس کے بغیر وہ بالکل معدوم تھی۔۔ غائب تھی۔ رونا پیٹنا ہوا۔ سیٹھ نے اس کے رُوم رُوم کو چوم کر قسمیں کھائیں، توبہ کی، جرمانے ادا کیے۔ ادھر کچھ کم آگ لگی ہوئی نہ تھی۔ وہ لڑکی تو بس یونہی اسے چھیڑنے کے لئے ڈال لی تھی۔ نہایت کمینی نکلی۔ اسے تو پیچھے لے کر پچھتا رہے ہیں

وہ رات ایسا معلوم ہوتا تھا اس کی سہاگ رات ہے۔ سیٹھ نے نیچے موٹر میں سے اپنا اٹیچی کیس منگوایا اور اسے جواہرات سے لاد دیا۔ مال کے پیٹ والا جوڑا پہنے، سر سے پیر سے زیور میں لدی وہ ان کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی، کھیلتی رہی۔

"اچھا کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔" انھوں نے گلاس اس کے ہونٹوں سے چھین کر پیار سے کولھے پہ تھپڑ لگایا۔

"کیوں؟"

"کہیں چلیں گے؟"

"کہاں؟"

"جہاں جی چاہے گا۔ اٹھو۔"

وہ اپنے سارے تیر ترکش سنبھالے، بے حیائی سے شرمائی، شمشیر برہنہ بنی اٹھی اور غسل خانے میں بھاگ گئی۔

"ارے سنو تو۔"

"کیا؟" وہ اٹھلائی۔

اس نے دونوں ہاتھ چوکھٹ پر رکھے اور پلٹی۔ آج وہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسی کم تیشی جوان چھوکری کی مہارت بھی آخر کوئی شے ہے۔

"اور کسی کی بزنس ہو گئی۔"

"سچی؟" وہ جھم سے پھر ان کے گھٹنے پر آکر لد گئی۔

"ہاں۔ ایک لاکھ پانچ ہزار کی ہوئی ہے، جس میں سے پینتالیس ہزار بلیک۔"

"وہ ہمارے۔"

"تمہارا تو سب کچھ ہی ہے، مگر"

"آپ بھی؟" وہ اترائی۔

"ظاہر ہے۔ مگر ابھی کتنا بلیک ہمیں بھی تو بھرنا ہے، تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بس کانٹرکٹ پر دستخط کر دو، تاکہ کل ایڈوانس مل جائے۔"

"آؤں۔ پہلے پپی دو۔"

"سیٹھ جی نے نیٹ وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ منہ میں لیا اور اس کا سر اپنے گھٹنے پر ٹکا کر انڈیل دیا۔

جب وہ دستخط کر رہی تھی تو سیٹھ کے ایک ہاتھ میں کاغذات تھے اور دوسرے ہاتھ میں محبت کا پیغام۔

سیاہ ساڑی اور جگمگاتے زیور پہنے جب وہ ملکۂ شب بنی ان کے ساتھ

جانے کے لیے نکلی تو اس کی آنکھوں میں آسمانوں کا نور تھا اور قدموں میں لرزش اس نے ایک نظر احسان صاحب پر سہمے ہوئے ڈالی اور دوسری نواسی کو کھانا کھلاتی ہوئی ماں پر۔ اس کا جی چاہا ابھی، اسی وقت ان سے بچی کو چھین لے اور پھر کبھی ہاتھ نہ لگانے دے۔ وہ دونوں کو مزہ چکھا دے گی۔ آج سیٹھ سے کہہ کر وہ اپنے لیے الگ فلیٹ لے گی، جہاں وہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کے ساتھ چین سے رہے گی۔ اب خدا کرے سیٹھ کی بیوی مر جائے تو پھر اسے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔

وہ رات — نیلوفر کی اصلی معنوں میں سہاگ رات — کتنی حسین تھی سیٹھ جی پر پھر سے نوجوانی آ گئی تھی۔ پچپن برس کی عمر میں بھی ان کی ہر بات میں اُمنگ تھی۔ احمد بھائی تو ایک سزا تھے۔ منوس حماقت۔ مگر سیٹھ جی تو جینے اور جلانے کا طریقہ جانتے تھے۔

پھر اسے کچھ یاد نہ رہا۔ وہ کہاں ہے؟ کن آسمانوں پر اُڑ رہی ہے؟ جب اس کی آنکھ کھلی تو بڑی دیر تک دنیا گھومتی رہی۔ جب نگاہیں کچھ ٹھیریں تو اس نے دیکھا وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے۔ اس کی سیاہ ساڑی، جو رات کے پھیلے ہوئے آسمان کی طرح جگمگا رہی تھی، بیچ کمرے میں اژدہے کی طرح کنڈلی مارے پڑی تھی اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ اس کا جی دھک سے ہو گیا، مگر پھر وہ اپنی بیوقوفی پر مسکرا دی۔ سیٹھ نے اس کا ایک ایک زیور اتارا ہو گا۔ کاش وہ اتنی مدہوش نہ ہوتی تو ان کے لمس کی لذّت سے محروم نہ رہتی۔ مگر کوئی سامان بھی نظر نہ آیا۔ شاید دوسرے کمرے میں ہو گا اور سیٹھ نہا رہے ہونگے۔

یا شاید دوسرے کمرے میں ہوں گے۔ مگر اندازے سے معلوم ہوا دوسرا کمرہ ہے ہی نہیں، سنگل روم ہے۔ جی گھبرانے لگا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور بیرہ چائے کی ٹرے لے کر آیا۔ اس نے جلدی سے اپنے اوپر چادر گھسیٹ لی۔

"صاحب کہاں ہیں؟"

"کون صاحب؟ ادھر تو کوئی صاحب نہیں آیا۔"

"کیا بکتا ہے گدھے۔"

"سچّی بیگم صاحب، آپ کا ڈرائیور آپ کو لایا تھا۔ رات بہت زیادہ ہو گئی تھی، پھر اس نے ڈبل پیے کیا، تب منیجر راضی ہوا۔ وہ بولا میم صاحب سِک ہے۔" بیرا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ وہ جانتا تھا چادر کے نیچے مال برا نہیں۔

نیلوفر کا دل بُری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا دل تو پاجی ہے جو خواہ مخواہ شک کرتا ہے۔ سیٹھ نے اسے ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیا؟" تو وہ کون تھا جو رات کو ..." وہ دماغ پر زور ڈال کر سوچنے لگی۔ کوئی تھا ضرور پاس تکیے پر بھی کسی کے سر کا نشان بنا ہوا تھا۔

تو کوئی تھا ضرور۔ سیٹھ نہیں تو پھر کون؟ پھر اس کے کپڑے زیور کس نے اتارے؟ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کون آسیب تھا جو رات کی تاریکی میں اس سے پیار کر کے چلا گیا؟ اور جو چپ چاپ اس کا گلا دبا دیتا تو؟

مگر جب منیجر نے بھی بیرے کے بیان کی تصدیق کی تو وہ وہیں کاونٹر پہ سر

رکھ کر رونے لگی۔

"ہوٹل کا بل تو چکا دیا گیا ہے۔ آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ شاید آپکی طبیعت زیادہ خراب تھی اور آپ کو یاد نہیں رہا۔ اکیلی ہی آئی ہوں گی۔" وہ ہمدردی جتانے لگا۔

اس کا جی چاہا کتے کا منہ کھسوٹ ڈالے، مگر ضبط اس کی عادت ثانی بن چکا تھا۔ اسے احمد بھائی کی پائریا زدہ بو برداشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ سورج مل جی کی ڈکاروں میں سگندھ آنے لگی تھی۔ اب منیجر کی گھومی گھومی پُر معنی باتوں کو سہارنا کون سا مشکل کام تھا؟

"اچھا ایک ٹیکسی منگوا دیجیے اور کمرے کا کرایہ۔۔۔" اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔

"اب گاڑی کا وقت تو نکل گیا۔ شام کو ریس میں نہیں جائیے گا؟" وہ بھیگیلی گیلی مسکراہٹ بکھیرنے لگا۔

"نہیں میں گھر جاؤں گی۔ اے روڈ، چرچ گیٹ۔"

"میڈم یہاں سے ٹیکسی میں بمبئی جا کر کیا کریں گی؟ اگر شام تک رک جائیں تو میں اپنی کرائسلر میں پہنچا سکتا ہوں۔"

"ٹیکسی منگواتے ہیں یا نہیں۔"

"مگر شاید آج کوئی ٹیکسی بمبئی کے لیے آسانی سے نہ ملے۔"

"کیا بمبئی بمبئی بک رہے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے پونا سے بمبئی تک کے لیے ٹیکسی۔"

"پونا ؟"

" جی پونا ہوٹل - بورڈ نہیں دیکھا آپ نے ؟ شاید رات کو کچھ زیادہ ... میرا مطلب ہے طبیعت خراب تھی ." وہ پھر کھیسیں کاڑھنے لگا .

" اوہ ___ ہاں ." وہ جھوٹ بولی " تو کیا سیٹھ جی کا فون آیا تھا ؟ "

وہ جی ہی جی میں سسک کر دعائیں مانگنے لگی : کاش سیٹھ جی کے گھر سے فون آیا ہو کہ رات کو ان کی بیوی کا ہارٹ فیل - اور سوتے میں وہ بڑی پیاری لگتی ہے نا ، اس لیے انھوں نے اسے جگایا نہیں ، چپ چاپ اسے چوم کر چلے گئے ہوں گے .

ظاہر ہے کہ رات نیلو نے اسے حد سے زیادہ پلا دی ہوگی اور وہ جب مدہوش ہو گئی ہوگی -
اور اتنی پی لینے کے بعد [illegible] میں چھوڑ کر نکلنے سکے نہیں ہوگا -
ڈرائیور نے اسے اٹھا کر کمرے میں پلنگ پر ڈال دیا ہوگا -
اور وہ اسی کے ساتھ رات گزار کر نہ جانے کب چپ چاپ چلا گیا -
جانے سے پہلے اس نے [illegible]

" کون سے سیٹھ ؟ "

" کنوڈیا سیٹھ . "

" کون ؟ رگھومل جی کہ تیج مل جی ؟ ابھی پچھلی اتوار کو تو بھان مل جی آئے تھے - کسی زمانے میں شکنتلا بائی سے بڑے زور کا عشق چلا تھا . وہ بڑے سیٹھ رو نگٹا پر لٹو تھی اور ... "

" میں سورج مل جی کو کہہ رہی ہوں ." نیلو فر جھلّا گئی . یہ مردے کتنے سیٹھ ہیں ؟ باپ ، بیٹے ، پوتے ، سب ہی اسی لت میں پڑے ہوں گے .

" سورج مل جی ؟ "

" ہاں . "

" تو ؟ "

" تو کیا - وہ رات کو آئے تھے ہمارے ساتھ ! "

"میڈم یہاں کوئی سیٹھ ویٹھ نہیں آئے رات کو، آپ اکیلی آئی تھیں۔ شاید کوئی ٹیکسی والا آپ کو اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔"

ٹیکسی ڈرائیور! نیلوفر کا سر لٹو کی طرح سنسنانے لگا۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ سیٹھ جی ہی تھے۔ وہ یونہی اسے کولیا بھر کے اٹھالائے تھے۔ وہی تھے۔ وہی بڑوں میں لسی ہوئی ڈکار بھی لی تھی انھوں نے۔ وہی تھے اسے لٹانے لگے تھے تو اس نے ان کے گریباں کو دانتوں سے پکڑ لیا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ وہیں زمین پر پسر گئے تھے۔

مگر نہیں۔" ان کے" گریبان میں تو ہیرے کے بٹن نہیں تھے! اب تو وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی تھا۔ ایک دم اس کے پیر لرزنے لگے۔ وہ چکرا کر برآمدے میں پڑی کرسی پر گر گئی۔

"میڈم!" مینیجر لپکا "چلیے اپنے روم میں چلیے۔"

"مجھے کال کرنا ہے۔" ناشتے کے بعد اس نے بیرے سے کہا۔

"ضرور ضرور۔" مینیجر جیسے دروازے کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ فوراً مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ نیلو فر اسے دیکھ کر چڑ گئی۔ کمبخت کتنا مسکراتا ہے۔ اس کے جبڑے بھی نہیں دکھتے۔

"میرا پرس گاڑی میں سے گر گیا۔ سیٹھ سے میں نے بہت کہا: روکو روکو۔ مگر کہنے لگے: لعنت بھیجو۔ میں نے کہا: اس میں سات سو کے نوٹ ہیں۔ بولے: لعنت بھیجو۔" وہ جھوٹ کا تانا بانا جوڑنے لگی۔ "پھر انھیں تار ملا کہ ان کی بیوی کی حالت خراب ہے۔"

حالانکہ وہ جانتی تھی سیٹھوں کی بیویوں کی نہ حالتیں کبھی خراب ہوں اور نہ کبھی وہ مریں۔ مگر اپنے دل کو سمجھانے کے لیے داشتائیں شاید یہی خواب دیکھتی رہتی ہیں۔ شاید ان کی بیویاں داشتاؤں کی موت کے حسین سپنے دیکھا کرتی ہوں گی۔ حالانکہ ان سیٹھوں کے یہاں نہ بیویوں کا ٹوٹا ہے نہ داشتاؤں کا۔ بیویاں نہیں مرتیں اور داشتائیں آجاتی ہیں۔ پہلی داشتائیں نہیں مرتیں کہ نئی آجاتی ہیں۔ جیسے ہر سال نئے ماڈل کی موٹر آجاتی ہے۔ نئے مال کی کچھ کمی نہیں رہتی۔

"مگر ٹرنک کال کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہوٹل بھی تو آپ کا ہے۔" مینیجر نے جذبات میں لتھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ نیلو فر میں چونکنے کی بھی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔ ٹرنک کال کرتے وقت خود اسے کوفت ہو رہی تھی۔ اماں سوالات کی بوچھار کر دیں گی، بال کی کھال نکالنے لگیں گی: مکان کے کرائے اور بچوں کی فیس کا دکھڑا رونے لگیں گی، کوڑی نہیں بھیجیں گی۔ وہ جانتی ہیں ابھی میرے چیک بک میں صفحے باقی ہیں۔ چیک کہیں بھی، کسی بھی "بینک" میں کیش کرایا جاسکتا ہے۔ مینیجر کنگال تو نہیں۔

"تو شام کو ریس پر چلیے گا۔" مینیجر نے آنکھوں میں رس انڈیل کر کہا۔

"بھئی ہمارے کپڑے ..." وہ ٹھنک کر بولی۔

"کپڑوں کی فکر نہ کیجیے۔" خوشی سے بے چارے کی گھگی بندھ گئی۔

اسی وقت کرائسلر میں بیٹھ کر وہ مین بازار گئی۔ دو تین ڈرین پائپ اور ٹی شرٹ، نائٹ سوٹ، ایک ڈریسنگ گاؤن اور میک اپ کا سامان

خریدا۔ تین چار ساڑھیاں خرید کر بلاؤز سلنے دے دیے۔ گھنٹہ بھر میں درزی نے تیار کر دیے۔

ریس کورس پہ گھوڑوں سے زیادہ مینیجر صاحب کی منھ زوریوں سے واسطہ پڑا۔ وہ جلد سے جلد اپنی وصولی پر جتے ہوئے تھے۔ کئی واقف کار، جو بمبئی سے ریس کھیلنے آئے تھے، ملے۔

"کہیے سیٹھ صاحب تو اچھے ہیں؟" رسماً کئی لوگوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے یونہی جواب دے دیا۔ اسے یقین تھا کہ ان لوگوں کو قطعی نہیں معلوم کہ آج کل وہ کس سیٹھ سے وابستہ ہے، مگر شاید اس کی کہانی اس کے چہرے پر لکھی جا چکی تھی کہ وہ سیٹھوں کی ہی گیند ہے۔ مینیجر صاحب بھی اس بات پر سینہ تان کر چلنے لگے کہ آخر خدا نے اس قابل کیا کہ وہ بڑے آدمیوں کی سیکنڈ کلاس گاڑیوں کی طرح ان کی محبوبائیں بھی وقتی طور پر خرید سکیں۔ آج تو مینیجر کی قسمت واقعی ساتویں آسمان پر تھی۔ جو بھی نوٹ اس نے نیلوفر کے ہونٹوں سے لگا کر گھوڑے پر ڈالا، دو گنا چو گنا ہو کر لوٹا۔ اور جب نیلوفر انھیں اپنے ہونٹوں سے لگائے گی تو وہ خود بھی دو گنے چو گنے ہو جائیں گے۔ انھوں نے وہیں نیلوفر کو اس کا کمیشن تھما دیا۔ مگر اس کے پاس پرس نہیں تھا، اس لیے مینیجر نے اس کا حصّہ رکھ لیا۔ انھیں اس پر بے اختیار پیار آ رہا تھا۔ وہ ان کی محبوبہ ہی نہیں، بجر بٹو بھی تھی، جس نے ان کی قسمت کو جگمگا دیا تھا۔

گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ جا کی ان کی پیٹھوں پر بندروں کی طرح چپکے ہوئے

تھے۔ لال، پیلے، اودے، نیلے بندروں پر جم غفیر کی نگاہیں چپکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ننھے ننھے چابک تھے اور جوتوں کی ایڑیاں گھوڑوں کے حساس رگ پٹھوں کو چھیڑ رہی تھی۔ بھڑکدار ساڑھیاں اچھل اچھل کر گھوڑوں کی ہمت بندھا رہی تھیں۔ ایک نہایت سفید، ہتنی کی طرح موٹی، پارسی لیڈی دھپا دھپ کود رہی تھی اور جوش میں اپنے پاس بیٹھے ہوئے لمبوترے سے شخص کو پیٹے ڈال رہی تھی۔ مگر اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر بالکل ایسے اچھل رہا تھا جیسے وہ بھی جاکی ہو اور بجائے گھوڑوں کے اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو۔ دو نوجوان میاں بیوی ہر ریس کے بعد آپس میں جھگڑنے لگتے۔ یقیناً وہ میاں بیوی ہی ہوں گے، کیونکہ اپنی ہار کا الزام وہ قطعی ایک دوسرے کے سر تھوپے جا رہے تھے۔ "یہ گھوڑوں کا نصیب ہے کہ جب تک دوڑتے رہیں جیتتے رہیں، انھیں سونے کا نوالہ کھلایا جاتا ہے۔ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو گولی مار دی جاتی ہے۔"

ایک دم نیلوفر کو احسان صاحب کے الفاظ یاد آگئے۔ وہ بوڑھی تو نہیں ہو رہی ہے؟ مگر کب تک نہ ہوگی؟ دس سال بیت گئے۔ آنے والے دس سالوں کا خیال کر کے اسے پسینہ آگیا۔ دس سال بعد وہ کیا کرے گی۔ سیٹھ سورج مل کی عنایت سے بیٹی بالکل تھوا ہے۔ ریس کا گھوڑا تو شاید کبھی نہ بن سکے، تانگے یا اکے میں بھلے ہی جت جائے تو پھر یہ آنے والے دس سال اس کے لیے کیا کچھ لائیں گے؟ سیٹھ کے بعد منیجر۔ اور؟۔ اور؟ کتنی سیڑھیاں ہیں اترنے کو؟ اور آخری سیڑھی کے بعد کیا ہے؟ پکی زمین یا خلا؟

اس کا دل مسلنے لگا۔ جاکی کا بوجھ اس کے کندھوں پر اور بھاری ہو گیا۔ بھاری بوٹ کی ایڑیاں کوکھ میں دھنسنے لگیں۔ چابک دماغ میں کڑکنے لگے جاکی اس کی ممی، احمد بھائی، احسان صاحب، سیٹھ جی، ساری دنیا!

"اب چلیے" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"ارے ابھی اصل ریس شروع نہیں ہوئی۔"

"نہ ہو، میری بلا سے، میں تو جاتی ہوں۔"

"مگر سنو تو۔ بس یہ آخری ریس ہے۔ پیسہ لگا دیا ہے، چھوڑ کر کیسے چلوں۔ بس پانچ منٹ کی بات ہے۔"

نیلوفر نے ابھی کھلا دھندہ نہیں کیا تھا۔ سورج مل جی کو تو وہ اپنا شوہر ہی بنا بیٹھی تھی۔ بالکل گرہستن بن گئی تھی۔ اس کے بعد بھی بالکل ہیاؤ نہیں اٹھا تھا۔ مینیجر اسے بڑی ہی نیچی ٹیڑھی سی معلوم ہو رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو تو وہ سیٹھ ہی سمجھی تھی اس لیے اس کا ضمیر صاف تھا۔ وہ اپنے ذہن میں اسے بجائے ٹیکسی ڈرائیور کے ایک نامعلوم اور پُراسرار ہستی سمجھ کر اپنا دل بہلا رہی تھی۔ اسنے دماغ پر بہت ہی زور ڈالنے کی کوشش کی، مگر کچھ یاد نہ آیا کہ ٹیکسی میں کیسے آ گئی! وہ تو سیٹھ کی گاڑی میں تھی۔ کیا سیٹھ اسے ایک انجان ٹیکسی ڈرائیور کو پکڑا کر چلتے بنے؟ ضرور کوئی راز ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر پھر یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگتا ہے: کیوں نہیں ہو سکتا؟ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ معصومہ نیلوفر بن سکتی ہے، امّی جان نائکہ بن سکتی ہیں، ابّا جان سب کو بھول سکتے ہیں، بھائی منہ موڑ سکتے ہیں تو پھر سیٹھ کون سا اس کا سگا ہے!

منیجر کو ہضم کرنے کے لیے اس نے اتنی شراب پی کہ اگر اسے کتے کے ساتھ سونا پڑتا تو وہ اسے بھی اسی جوش سے چومتی۔ اس دن اس نے بیسنی کی طرف بڑے لمبے لمبے ڈگ بڑھائے ننگ دھڑنگ سارے کمرے میں ناچتی پھرتی۔ پھر غڑاپ سے گرم پانی کی بھر ٹب میں کود پڑی۔ منیجر کی بے تابیوں کو ٹھکرا کر وہ پانی میں اینڈتی رہی۔ بڑی مشکل سے نکالا تو وہ وہیں کموڈ سے سر ٹکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا نشہ اکھڑنے لگا۔ منیجر سے ڈر لگنے لگا۔

"تم ۔ تم میری عزت لینا چاہتے ہو کمینے! بدمعاش! حرام زادے!" وہ غسل خانے کا سامان اٹھا اٹھا کر اس کے سر پر پھینکنے لگی۔

بے چارہ منیجر سٹپٹا گیا اور کرسی پر گر کر پسینہ پونچھنے لگا۔ تب اسے اس پر بڑا رحم آیا۔ چوپائی پر ایک دن ایک لنگڑا کتا پڑا تھا۔ اس کے زخموں میں سفید سفید چاول جیسے کیڑے ہل رہے تھے۔ نیلوفر اسے دیکھ کر دھاروں دھار رونے لگی تھی۔ منیجر کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر اسے قے آ رہی تھی۔ مگر اس نے اس زخمی کتے کو یاد کیا اور اسے چمکارنے لگی:

"پچ پچ ۔ موتی موتی ۔"

منیجر سہما ہوا، گھگیائی نظروں سے دیکھتا پھر اس کی طرف بڑھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے تولیہ سے اس کا بدن خشک کیا۔ وہ چپ رہی۔ پھر اسے چپ چاپ مسہری پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔ نیلوفر ہنسنے لگی۔ اترتے ہوئے نشے سے ڈر کر اس نے جلدی جلدی پورا گلاس حلق میں اتار لیا۔ کمبل کو لات مار کر دور پھینکا۔ منیجر بالکل چوہا ہو گیا۔ نیلوفر نے سفید ہلتے ہوئے چاولوں کی ابکائی

حلق میں گھونٹتی اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا دیے۔

تین روز میں اس نے اتنی شراب پی کہ ساری عمر کی ملا کر اتنی نہ پی تھی اسے معلوم ہوا امینجر اتنا مشکل نوالہ نہیں کہ گھونسا مار کر حلق کے پار نہ کیا جائے پرس خریدنا بھول گئی، ورنہ وہ غریب تو اس کے حصہ سے کہیں زیادہ دے رہا تھا۔ خیر چلتے وقت لے لے گی۔ اسے پیسے رکھنے کا سلیقہ نہ تھا۔ پرس سجاوٹ کے لیے ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی۔ اس نے تو برسوں سے روپیہ غور سے دیکھا بھی نہ تھا۔ سکے ڈھالنے کی مشین کی طرح وہ روپیہ بناتی تھی، جیسے ممی بڑے سلیقے سے رکھتی تھیں۔ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا: ماں اپنی اولاد کی خاطر دنیا بھر کے دکھ اٹھاتی ہے۔ چکی پیس کر، سلائی کر کے بچوں کا پیٹ پالتی ہے مگر اس کی ماں نے تو چکی چھوڑ کبھی سنڈ(مندرا)ل بھی نہیں گھسا۔ نانی جی نے پال پوس کر بڑا کیا۔ ہمیشہ پھپھیوں، خالاؤں نے سوئٹر بنے، فراکیں سیں۔ استانیوں نے پڑھایا۔ ہاں مجبوراً نو مہینے پیٹ میں ضرور رکھا۔ ان کا بس چلتا تو کسی انّا یا دائی کے پیٹ میں ہی اسے پلوا لیتیں۔ بس ان نو مہینوں کا وہ کرایہ وصول کر رہی تھیں، مع ٹیکس بگڑی کے۔

تب وہ دعا مانگنے لگی کہ اللہ کرے ممی مر گئی ہوں۔ سفید سفید کفن میں ان کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے بڑی ہنسی آئے گی۔ پھر وہ ان کی بڑی مضبوط اور پکی قبر بنوا کر اس پر لوبان جلوائے گی۔ پھر بچوں کی فیسوں کے تقاضے ختم ہو جائیں گے۔ زبیدہ کی شادی کے لیے روپیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر وہ ان کے بچے کیوں پال رہی ہے؟ وہ بھی ان کی لڑکی ہے، اُن کا

خصم تو نہیں۔ پھر وہ اسے خصم سمجھ کر تقاضے کیوں کرتی ہیں؟

سارا دن وہ پڑی سوتی رہتی۔ شام کو کرائسلر میں سیر کو جاتی۔ چھ سات بجے لوٹ کر پینے کا پروگرام شروع ہو جاتا۔ رات گئے تک عیش رہتے۔ چوتھے دن اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ برسوں سے اسی مینیجر کے ساتھ رہ رہی ہے۔ رہتے رہتے جی گھبرا گیا ہے۔ دن کتنے لمبے ہیں، راتیں شیطان کی آنت کی طرح کتنی طویل، خواب کتنے اچھے ہوتے، کتنے ناتمام!

جب بور ہو جاتی تو مینیجر کو گالیاں دینے لگتی۔ جوتے مارتی، پھر جب وہ لنگڑے کتے کی طرح مری مری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا تو ہنس کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ یکسانیت سے تنگ آ کر وہ بمبئی جانے کو تیار ہو گئی۔ مینیجر کی گھگی بندھ گئی۔ اس کا دل بہلانے کے لئے وہ پرائیویٹ فرنچ فلم دکھائے، جسے دیکھ کر اسے سچ مچ الٹی ہو گئی اور وہ اس کے منہ پر تھوک کر غسل خانے میں بند ہو گئی اور کموڈ سے سر ٹکائے، زمین پر بیٹھی، گھنٹوں روتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنا بند ہو گیا، جیسے سوتے سوکھ گئے ہوں۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" پھر خود ہی اس نے سوچا اور بجھے دل سے آ کر پلنگ پر پڑ گئی۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ دل میں وحشت کے طوفان اٹھ اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک دم پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں اندھیرا رینگ آیا تھا۔ مینیجر نوکروں پر غصہ اتار رہا تھا۔ لوگ کمروں میں بند بیٹھے نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ الماری میں پڑی بوتل میں مشکل سے ایک پیگ نکلا۔ چڑھ کر

اس نے گھنٹی بجا کر بیرے کو بلایا۔

"ہم کو ٹیکسی لا کر دو۔ بمبئی جانے کا ہے۔"

"بمبئی کا گاڑی اس وقت نہیں جائے گی۔"

اوہ! اس کے نصیب کی گاڑی کب جائے گی؟ اس کا جی گھبرانے لگا۔ وقت کاٹنے کے لیے پلنگ پر پڑے پڑے اس نے پہلے بیر اور پھر وہسکی پینی شروع کر دی منیجر جب سہما سہما آیا تو وہ گندی گندی باتیں کر کے ہنسنے لگی۔ پھر وہی فلم، جنھیں دیکھ کر اسے الٹی ہو گئی تھی، دیکھنے کی ضد کرنے لگی۔

اس دن تو منیجر نشے میں تھا، آج نیلو فر نشے میں تھی

"اگر کسی نے رپورٹ کر دی تو میرا ہوٹل بند ہو جائے گا۔" وہ بہانے کرنے لگا۔ گئے سال نہ جانے کس نے خبر کر دی، پولیس نے میرا ناطقہ بند کر دیا۔ وہ تو بیچ میں نواب صاحب پڑے تب جا کر کہیں پیچھا چھوٹا، ورنہ تڑی پار کر دیتے۔ نواب صاحب نے کہا: میری فلم ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ مٹھی گرم کر دی۔"

"پھر؟"

"ارے پھر سالے خود بھی بیٹھ کر دیکھنے لگے۔"

فلم دیکھ کر پھر نیلو فر حواس باختہ ہو گئی۔

"اُف! کمبخت کیوں دیکھتے ہیں؟ موت آئے نامرادوں کو!"

"دل کے بہلاوے کے لیے۔ دوسرے..."

"دوسرے کیا؟"

مینیجر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جانے دو۔"

"بتاؤ نا۔ تمہیں ہماری قسم۔"

"سورج مل جی کو شوق نہیں؟"

"کس بات کا؟"

"کیوں بن رہی ہو؟"

" مینیجر نے اسے بتایا کہ بہت سے ہوٹل میں ٹھیرنے والوں کو عجیب عجیب شوق ہوتے ہیں۔ لوگ بمبئی میں جب کاروبار سے تھک جاتے ہیں تو یہاں جی بہلانے کو آجاتے ہیں۔

اگر کوئی ہوٹل لڑکیاں اور شراب نہ مہیا کرے تو چار دن میں اجڑ جائے۔"

"لڑکیاں کہاں سے بلواتے ہو؟"

"ارے ہمیں بلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لڑکیاں خود یا ان کے دلال الٹا ہمیں کمیشن دیتے ہیں کہ ہم انھیں سیٹھوں تک پہنچا دیں۔ کچھ پہلے ہی سے انتظام کر کے آتے ہیں۔ میں خود کوئی چیز سپلائی نہیں کرتا۔ بیرے سب معاملہ ٹھیک کر دیتے ہیں۔ بس میں ذرا دوسری طرف دیکھنے لگتا ہوں۔"

"کسی دن دھر لیے جاؤ گے۔"

"اجی ایسی کچی گولیاں ہم نے نہیں کھیلی ہیں۔ چار کھونٹ چوکس معاملہ نہ ہو تب تک میرے نوکر کبھی منہ نہیں لگاتے۔ باقاعدہ رجسٹر میں خانہ پری رہتی ہے۔

افسروں کو کھلانا پلانا بھی پڑتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ بے کار کو تنگ نہ کریں۔ وہ تو کھوٹا دھندہ نہ بھی کرو تو بھی ہم لوگوں کی بڑی آفت ہے۔ کھلاؤ نہ تو آئے دن پریشان کرتے رہتے ہیں۔ سالہ ہیڈ بیرا بڑا تنگ کیا کرتا تھا۔ یونین کا لفڑا شروع کر دیا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ میرے آدمیوں کو پگار کی کبھی دیری نہیں ہوئی۔ مزے سے جتنا چاہو پیٹ بھر کھانا کھالو۔ ٹپ میں مینجمنٹ کا چھ آنے شیئر ہے۔ وہ خیر کوئی بات نہیں۔ مگر سالے نے پر نکالنے شروع کر دیے۔ آٹھ سال سے میرے ساتھ تھا۔ کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ آپ ہی آپ نہ جانے کیا دماغ میں کیڑا رینگا کہ الٹی سیدھی بانکنے لگا۔ میں نے کہا: سالے ایسی تیسی تیری اور تیری یونین کی۔ بس میں نے تین چار جتنے بھی اس کے گرگے تھے، سب کو نکال باہر کیا۔ ارے حضور انھوں نے تو ہوٹل کے سامنے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ آتے جانے کو ہلکان کرتے۔ بس میں نے اچھا کر درست کر دیا۔"

"کیسے جی؟" نیلوفر کو مینیجر کی ڈینگوں میں بڑا مزا آرہا تھا۔

"بورے کا بورا ایکس پکڑوا دیا بدیشی شراب کا سالے کے گھر میں۔"

"اے ہے۔"

"ہزار پانچ سو کا خرچہ ہوا تو کیا؟ سارا عملہ خوش ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"کورٹ میں تو ایک ہی بوتل کافی تھی، سو پیش کر دی گئی۔ باقی کا بکس یہیں

اسی ہوٹل میں لاکر گلچھرّے اڑائے سالوں نے۔"

"کیسے بدذات ہو تم لوگ۔ اور یہ اینٹی کرپشن والے کچھ نہیں کہتے ان کمبختوں کو؟"

نیلوفر جو دعرق پی رہی تھی، مگر اسے غصہ آگیا۔

"ارے کیا اینٹی کرپشن۔ اپنے یہاں کوئی معمولی لوگ ٹھیرتے ہیں۔ اپنی بڑے بڑوں سے دانت کاٹی روٹی ہے۔ مجال ہے جو چوں بھی کرجائے کوئی۔ ہاں بس اتنا فرق ہوا، پہلے ایک کو بھگتنا پڑتا تھا، اب دو کو۔"

"یعنی کرپشن اور اینٹی کرپشن؟"

"ہاں جی۔"

"اس رات نیلوفر نے کئی اور سیڑھیاں پھلانگ ڈالیں۔ مینیجر صاحب کے زیر سایہ اس نے ان فلموں سے فن سیکھا۔ پہلی مرتبہ گانجے کی سگریٹ پی اور مورفیا کا انجکشن بھی آزمایا۔ دوچار دفعہ دیکھنے کے بعد اسے ان فلموں میں مزہ آنے لگا۔ اس کی جسم ہی نہیں روح بھی ننگی ہو گئی۔ وہی نیلوفر جو کبھی معصومہ تھی اگر ایک دفعہ اس کی خالہ جان نہاتے میں غسل خانے میں گھس آئی تھیں تو ایسے بھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی تھی اور کسی نے پتھر سے چکناچور کر دیا۔ خالہ جان نے قسمیں کھائیں کہ غسل خانے میں اندھیرا تھا، انھیں کچھ نظر نہیں آیا، مگر اس کا جی نہ ٹھیرا، کیونکہ اس نے تو محسوس کیا تھا۔ آج اس کی دنیا ننگی ناچ رہی تھی اور عزت تال دے رہے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ نیلوفر کا بدن ٹوٹنے لگا تھا اور بے طرح جمائیاں آرہی تھیں۔

وہ جس دن سے پونا آئی تھی گھر کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ نہ ہی اس نے کوئی اطلاع دی۔ ممی گھبرا تو نہ رہی ہوں گی؟ وہی ممی جو اسے ایک دن کے لیے پھوپھی کے ہاں بھیجتے جھجکتی تھیں کیوں کہ ان کے جوان جوان بیٹے تھے۔ وہ آج اتنے دن سے غائب تھی مگر انھیں شاید فکر نہ تھی، جیسے وہ عورت ہی نہیں، اس کی عصمت ہی نہیں۔ ایک آبرو باختہ عورت کی ماں باپ کو کیا ڈر؟ یہ بھی تو ڈر نہیں کہ کوئی اس کا گلا ہی گھونٹ دے گا۔ کوئی کاٹ کر ندی میں بہا دے گا۔ اب وہ ان کی ناک نہیں چوراہے کی ناک تھی، جو جڑ سے کٹ چکی تھی۔

اتنے میں مینیجر صاحب حواس باختہ بھاگے آئے۔

"غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟"

"راجہ صاحب آئے ہیں۔ یہ سورج مل سالہ پکا حرامی ہے۔"

"کیا ہوا؟" نیلوفر نے چڑ کر پوچھا "کیا اوٹ پٹانگ بک رہے ہو؟ کون اجڑے راجہ صاحب آگئے؟ اور آگئے تو تم کاہے کو بولا رہے ہو؟"

"نہیں تو۔" مینیجر صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ مگر پھر جھلا کر بولے:

"سالہ کہتا ہے جگا دو۔ اس کی تو ماں کی ..."

"چولھے میں جاؤ، مرو۔ نہ جانے کیا ہانک رہے ہو کسے جگا دو؟"

"تمھیں۔" روہانسی آواز میں بولے۔

"اے جی میں جاگ تو رہی ہوں۔" کاش وہ جاگ نہ رہی ہوتی، یہ ایک بھیانک خواب ہوتا؛ دس برس لمبا؛ جلتا، سلگتا دوزخ کا خواب — اور

وہ جاگ پڑتی۔ کتابیں اٹھا کر وہ ممی سے ٹھنک کر کہتی: "آج ہسٹری کا ٹیسٹ ہے۔ ناشتہ دینا ہے تو جھٹ پٹ دے دیجیے، ورنہ میں جاتی ہوں۔" مگر نہیں شاید وہ سوئی ہی نہیں، کبھی نہیں سوئی۔ اور نہ کبھی کنوار پنے کی دوشیزہ نیند پھر اسکی آنکھوں کو چومے گی۔ وہ یوں ہی آنکھیں پھاڑے خلا کو تکتے تکتے ایک دن سرد ہو جائے گی۔ پھر منوں مٹی تلے اس کے سارے سپنے ٹوٹ کر سفید بلتے ہوئے کیڑے بن جائیں گے۔

پھر مینیجر نے بتایا کہ سورج مل نے اسے نواب کو بخش دیا۔ بخشا کیا، وہ دو چار ماہ کے لئے مع بیوی بچوں کے ہانگ کانگ، سنگاپور وغیرہ جا رہے ہیں۔ ابھی تو بیوی بچے جا رہے ہیں، وہ دہلی سے سیدھے پہنچ جائیں گے۔ شگوفہ کے ساتھ۔ فلم ابھی تو ٹھپ پڑی ہے۔

"میری فلم کو ٹھپ کرنے والے وہ ہوتے کون ہیں۔ ایسی کی تیسی ان کی۔ اور شگوفہ کو نکال باہر کروں گی مردار کو۔ سب کچھ تو میرے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ تم جانو۔ اب اس وقت راجہ صاحب کا کیا ہو گا؟"

"ہو گا تمہارا سر۔"

"وہ تمہیں لینے آئے ہیں۔" مینیجر نے سسکی لی۔

"مجھے کیوں لینے آیا کتا؟"

"ارے آہستہ بولو۔"

"کیوں آہستہ بولوں؟ اس کا دیا کھاتی ہوں؟"

"کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ تمہاری ماں کو مہینہ کا خرچ دے کر آیا ہے۔"

"کیا؟"

"تم خود بات کرلو۔"

"میں نہیں کرتی بات وات۔ تم انکار کردو۔"

"انکار کردوں؟ مگر..."

"کہہ دو ہم شادی کررہے ہیں۔"

"ارے رے یہ کیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟ وہ میرا سر کھاجائے گا۔ جانتی ہو بڑے بڑے عہدے داروں اور منسٹروں کا لنگوٹیا یار ہے۔ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ راجے مہاراجے ختم ہوگئے۔ اب بے فکری کی زندگی مل گئی ہے۔ نہ ریاست کی پروا، نہ کچھ۔ مزے سے پندرہ لاکھ پاکٹ منی مل جاتی ہے، عیش کرتے ہیں سالے اس ہوٹل پہ بہت دنوں سے دانت ہے۔ میں نے بڑی بنتی کری کہ میری زندگی کا ٹھیکرا ہے، ورنہ وہ تو اسے آج پگڑی دے کر خرید لے۔ پانچ سال کا میرا کانٹریکٹ ختم ہو رہا ہے۔ بلا کا کمینہ ہے۔"

"مگر میں تو اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔"

"وہ... وہ کہتا ہے نکال دو۔"

"کیا کہتا ہے — نکال دو؟ اس کے باپ کا ہے ہوٹل؟ حرامی بلّا!"

"ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں بڑی رانی صاحبہ سے مسٹر انجنیئر کا بڑا یارانہ تھا۔"

"کون مسٹر انجنیئر؟"

"اس ہوٹل کے مالک کا چچا۔ بے اولاد مرا، سب بھتیجے کو دے گیا۔ رانی صاحبہ نے اسے بہت دیا تھا۔"

"ہوں۔ تو پھر نکال دو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں نیلو فر بائی" مینیجر کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے بڑی منت سماجت کی، سالہ ٹھوکریں مارنے لگا کہ ہماری ریس کرتے ہو۔ وہی اپنی ٹینیوں گھاٹنوں تک رہو۔ دماغ خراب ہوا ہے۔ کہو، سالے ہم بھی تو انسان ہیں۔ دل آجائے تو کوئی کیا کرے؟"

"تو پھر کیا کرو گے؟"

"یہی تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔"

"مگر میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"اب میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔"

اتنے میں بیرے نے دروازہ کھٹکھٹایا:

"راجہ صاحب بولتے ہیں ہم کو دیر ہوتی ہے۔"

"ہاں ہاں ابھی آتی ہیں۔ نہا رہی ہیں۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اٹھو" انھوں نے پھسلتے ہوئے ڈریسنگ گاؤن کا گریبان بند کر کے کہا۔

"نہیں نہاتی۔" نیلوفر نے سارے بٹن کھول دیئے۔ مینیجر کی گھگھی بندھ گئی ان کے پسینے میں تر گیلے گیلے ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کے پٹ بھیڑنے کے بجائے بہکنے لگے۔

"سنو۔" اس نے گردن پر سے ان کی رال پونچھتے ہوئے کہا

"کیا؟" مینیجر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"چلو غسل خانے سے نکل کر بھاگ چلیں۔"

نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مار ڈالے گا۔" ان کی حالت اس چوزے کی سی تھی جو مالی کے ڈر سے بھاگتا جاتا ہے اور پھل بھنبھوڑتا جاتا ہے۔ آدھا پورا جو بھی ہاتھ لگ جائے۔

"کیوں نہیں؟" نیلوفر نے انھیں پرے دھکیل کر کہا۔

"وہ... وہ... بات یہ ہے کہ... وہ تم تیار تو ہو جاؤ۔"

"پہلے بتاؤ کیوں نہیں؟ کیا میں تم کو پسند نہیں۔"

"ہو پسند۔"

"میرے اوپر جان جاتی ہے؟"

"جاتی ہے!"

"میرے بنا جی نہیں سکتے؟"

"نہیں جی سکتا!"

"تو پھر چلو بھاگ چلیں۔"

"نہیں... مگر..."

"کیوں؟ اگر مگر کاہے کی؟"

"وہ بات یہ ہے اب تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

"تم نے اتنے پیسے خرچے میرے اوپر، تمہارا ابھی تو کچھ حق ہے۔"

"ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے بچا لو۔ بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیا سب دے دیے اس نے؟" نیلوفر نے اس کی ہچکچاہٹ سے تاڑتے

ہوئے کہا۔

"ہاں۔" مینیجر صاحب نے آنکھیں چرا کر چھت کی طرف دیکھا۔

"اوپر سے کتنے؟"

"کچھ بہت نہیں۔"

"کتنے؟ بتاؤ۔" اس نے لات مار کر کہا۔

"دس ہزار۔" مینیجر صاحب اس کی زد سے بچ کر دور ہو گئے۔

"تو واپس کر دو۔"

"واپس۔ وہ نہیں لے گا۔"

"تم منہ پہ مار دو جا کے۔ مجھے چاہتے ہو تو واپس کر دو۔ نہیں کر سکتے؟"

"میں مجبور ہوں۔"

"مجبور ہو؟"

"ہاں میں غریب آدمی ہوں، بال بچوں والا ہوں۔ مالک مجھے بڑا تنگ کرتا ہے۔ اس روپے سے میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لوں گا۔ اس نامراد سے پیچھا چھوٹے گا۔"

"تم بال بچے والے آدمی ہو؟"

"ہاں بائی۔"

"اور مجھ پر مرتے ہو؟" چپ!

"میرے بغیر جی نہیں سکتے؟" چپ!

"میرے لیے جان دے سکتے ہو مگر روپیہ واپس نہیں کر سکتے؟"

"مگر اس سے کیا ہوگا۔ وہ بڑا ضدی ہے۔ میں اس سے کیسے ٹکّر لے سکتا ہوں!"

"اچھا تو اس پیار کی خاطر ایک بار میرے ہونٹ تو چوم لو۔"

منیجر بھڑکا۔

"دام نہیں خرچنا ہوں گے۔ مفت۔ بس ایک بار تو مجھے باہوں میں لے لو۔" اس نے ڈریسنگ گاؤن کرسی پر چھوڑ دیا اور کھڑی ہو گئی۔

اور جب منیجر صاحب کے گیلے گیلے رال میں تر ہونٹ اس کے قریب آئے تو اس نے اپنے دل کا سارا غصّہ، ساری ہتک منہ پر سمیٹ کر اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

"بھئی واہ!" راجہ صاحب دروازے میں کھڑے اسے آنکھوں سے ٹٹول رہے تھے۔ منیجر سیٹ سے باہر نکل آیا۔

"دراصل قصور سارا میرا ہے۔" انھوں نے ٹھوکر سے دروازہ بھیڑ دیا اور بڑی تکلّفی سے پلنگ پر اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے۔ "وہ سالانہ مشاعرے کی صدارت کرنا تھی، ادھر پھنس گیا۔ بہت کہا: بھئی کسی اور کو پکڑو۔ مگر نہیں صاحب، سر ہو گئے کہ حضور آپ کے سوا اس مشاعرے کی صدارت کوئی نہیں کر سکتا۔ ورنہ کہیے تو مشاعرہ ہی ملتوی کر دیں۔ اب میں نے سوچا: چیریٹی فنڈ کا مشاعرہ ہے جھیل جاؤں تو اچھا ہے۔ پھر تم جانو جب شعرا جمع ہوں تو پینے پلانے کا پروگرام چلتا ہی ہے۔ پھر میں دعوت نہ کرتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بس اسی میں اتنے دن لگ گئے۔"

راجہ صاحب

"نیلوفر ڈریسنگ گاؤن کے بند باندھتی وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کئی دعوتوں، پارٹیوں اور مشاعروں میں راجہ صاحب کو دیکھا تھا۔ ساٹھ باسٹھ کا سن، مگر لوہے کی لاٹھ بنے رکھے تھے۔ رنگین مزاج تھے۔ جب سے ریاست چھٹی تھی محل کی لونڈیاں تو بہت سی ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ ادھر ادھر کہاں، سیدھی عیش گھر جا پہنچی تھیں۔ جو ذرا سلیقے والی تھیں انھوں نے شادیاں کر ڈالی تھیں۔ باقی وہی دھندہ وسیع پیمانے پر کر رہی تھیں۔ اب راجہ صاحب کا ٹیسٹ بھی بدل گیا تھا۔ نام کی فلم اسٹاروں اور تباہ حال خاندانی بہو بیٹیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ راجہ ہوتے ہوئے بھی جدید ترین سرمایہ دارانہ دماغ کے مالک تھے اور بڑی تیزی سے بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں جائیداد بنا رہے تھے۔ کئی بڑی ولایتی فرموں میں حصے تھے۔ ملابار ہل اور پیڈر روڈ پر فلیٹ بنا بنا کر اونچی پگڑی پر اٹھا رہے تھے۔ انھیں اینگلو انڈین اور یورپین عورتوں سے کراہت آتی تھی۔ اس معاملے میں وہ انتہائی دیشی تھے۔ ہمیشہ بدیسی مال پر دیسی مال کو ترجیح دیتے تھے۔ ہوم انڈسٹری کے اس صیغہ کو ان کی ذات سے بڑی ترقی ملی۔ نیلوفر پر ان کی عرصے سے نظر تھی مگر سورج مل ہچر مچر کر رہا تھا کیونکہ شگوفہ سے پہلے وہ واقعی نیلوفر کو چاہتا تھا۔ انھیں سورج مل کی ایک گھوڑی بھی پسند تھی، مگر وہ کسی قیمت پر بھی بیچنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔

"سورج مل جی اس گھوڑی کا الگ کرنے کا جب کبھی ارادہ ہو تو مجھے بتائیے گا۔" وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ آخر انھوں نے اونچی قیمت لگا کر

سورج مل کا ارادہ کر ہی لیا۔ انھیں نیلوفر بھی مل گئی اور گھوڑی بھی صرف سورج مل کی زیر تکمیل فلم مع سارے گھاٹے کے خریدنا پڑی۔ اس قسم کی خرید و فروخت آپس میں 'دوستوں میں' ہوا ہی کرتی ہے۔ اس فلم کی قیمت وہ جب چاہیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ فلم انشورڈ ہے، گو دام انشورڈ ہے، کسی دن بھی آگ لگ سکتی ہے اور مال سے دوگنا نقصان دکھایا جا سکتا ہے۔ تاکہ بڑھتے ہوئے منافع کا کچھ حصہ ادھر ڈوبتا دکھایا جا سکے یہ سب بزنس کے گر ہیں۔ ان کی دادر والی کپڑے کی مل میں اتنا منافع ہوا چھکے چھوٹ گئے۔ اچھی قیمتی مشین راتوں رات وہاں سے اٹھوا کر آگ لگوا دی۔ بعد میں وہی مشین کسی دوسرے کی کہہ کر دوگنی قیمت پر خرید لی۔ کچھ گھپلا ہوا تو شاندار دعوتیں کیں، یارانے کام آئے۔ مصیبت یہ ہے کہ راجہ صاحب جس کمپنی کا حصہ لے لیں وہ سونا اگلنے لگتی ہے۔

"مگر وہ فلم آپ نے کیسے خریدی؟ وہ تو میری ہے۔" نیلوفر نے کھانے پر کہا۔

"ہاں وہی فلم جو تم نے سورج مل جی کو بیچ دی۔"

"میں نے تو خاک نہیں بیچی۔"

"میں کچا کام نہیں کرتا۔ میرے وکیل نے بڑی چھان بین کر لی ہے۔ تم نے سورج مل جی کو ہنڈیاں لکھ کر دی تھی۔"

"ہنڈیاں؟ نہیں تو۔"

"تم نے کبھی دستخط دیے تو ہوں گے، کسی رسید پر۔"

"نہیں۔ ہاں وہ بچوں کو فیس جاتی تھی اور کبھی سٹوڈیو کے متعلق کوئی پراپرٹی آتی تھی اس کے علاوہ صرف پکچر کی سیل کے وقت دستخط کیے، تو وہ سب وکیل دیکھ لیتا تھا۔"

"تمہارا وکیل یا سورج مل کا۔"

"اے بھائی میرا وکیل۔ احسان صاحب۔ اوہ!" وہ ایک دم سناٹے میں رہ گئی۔

"احسان صاحب ایک حرامی ہے۔"

"مگر جب تک تو ہمارا جھگڑا ابھی نہیں ہوا تھا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا اس میں جھگڑے کو کیا دخل ہے۔ سورج مل جی کچھ پیسہ تمہارے نام سے بزنس میں لگانا چاہتے ہوں گے، مگر احمق تو ہیں نہیں، اپنی پوزیشن پکی کر لی ہو گی۔"

سورج مل کے کنڈون کا ذکر

اور لوگ کہتے تھے نیلوفر نے سیٹھ کو پھانسا ہے، دونوں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے۔

"اونہہ، جانے دو۔ وہ کمبخت بڑا ہی چلتا پرزہ ہے۔ تم جیسی بھولی لڑکی ہاتھ لگ گئی۔ حال ہی میں تم نے فلم ان کے نام کی ہے۔ تمہیں یاد نہ رہا ہو گا۔"

اور نیلوفر کو یاد آگیا: اس دن زیور پہنا کر جب سیٹھ نے اپنی ہوس کی پوجا کی تھی تو اس کے دستخط ایک دستاویز پر لیے تھے۔

"گدھی کی بچی!" اس نے اپنے وجود کو گالی دی۔ سیٹھ کے ہاتھ اسے بچھوؤں کی طرح جسم پر رینگتے محسوس ہوئے اور اس نے جھرجھری لی۔

"اوہ سمجھا تو۔ تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ بھئی یہ کنوڈیا کمبخت جینیس ہے۔ میری تو عقل دنگ رہ جاتی ہے جب اس کے کارنامے سنتا ہوں۔ اتنا لمبا چوڑا کاروبار ہے مگر کس خوبی سے معاملہ بٹھایا ہے کہ کوڑی انکم ٹیکس کی آج تک نہیں بھری۔ یہ انکم ٹیکس والے دس اور پندرہ روپے تو بڑی دھوم دھام سے وصول کرتے ہیں، مگر یہ جو فلم آرٹسٹ لاکھوں بلیک لیتے ہیں اسے نہیں پکڑ پاتے۔ ڈھائی ہزار سے تین سوا تین ہزار آمدنی والے کی جان کو لاگو ہو جاتے ہیں۔ اگر سی۔ آئی۔ ڈی۔ انھیں گرفتار کرنا چاہے تو سو طریقے تو میں بتا سکتا ہوں انھیں گھیرنے کے۔ دراصل اس کا بیوپار سیکڑوں ناموں سے پھیلا ہوا ہے۔ جتنی لڑکیاں رکھتا ہے ان کے نام سے ساری چار سو بیس کرتا ہے۔"

"یا بیوی کے نام سے کرتا ہے؟"

"نہیں۔ اس معاملے میں وہ بڑا شریف آدمی ہے۔ بیوی کے سیف ڈپازٹ میں صرف سونا اور جواہرات ہیں۔"

"راجہ صاحب صاف اور کھرے آدمی تھے۔ انھوں نے صاف بتا دیا کہ معاملہ قطعی بیوپاری ہے۔ انھیں کبھی عورتوں کی کمی نہیں رہی، نہ رہے گی، انھیں عرصے سے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اونچے طبقے میں سوسائٹی لیڈی کی طرح آجا سکے۔ انھیں سرکاری حلقوں میں کام پڑتا ہے۔ وہاں یہ کچرا مال، جو پون پل یا کلابہ وغیرہ میں ملتا ہے، قطعی نہیں چلتا۔ انگریزی بولنی آتی ہو، مگر ہندوستانی کلچر سے واقف ہو، بڑوں کا چھتہ سر پہ بنائے، مگر دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرے یا لکھنؤ کی نواب زادیوں کی طرح آداب عرض کہے۔ ہینڈلوم کی ساڑی پہنے، مگر کاک ٹیل کا پیمانہ

نازک انگلیوں میں تھام سکے۔ کچھ ایسا کچھ مر ہو کہ ہر قوم کا فرد مسحور ہو سکے۔ جیسے جاہل ہندوستانی دیکھیں تو انگریز سمجھیں، اور انگریز اسے اجنتا کی گپھاؤں سے نکلی ہوئی کوئی خوابوں کی شہزادی سمجھیں۔ پھر ساتھ میں کسی بھاری بھرکم خاندان کی شان و شوکت بھی ہو۔

آمدنی کم و بیش وہی رہے گی جو کنوڈیا جی کے زمانے میں تھی۔ ساتھ میں سوسائٹی میں عزت ملے گی، سوالگ۔ یورپین لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ اپریل کے آخر میں یورپ کے دورے پر جانا ہوگا۔ ویسے خود وہ ان باتوں میں اب کمی کرتے جا رہے ہیں۔ صحت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ سورج مل جی کا قطعی نوٹس نہ لیا جائے ویسے نوٹس لینے کی وہ شخص کسی معاملہ میں گنجائش بھی نہیں چھوڑتا۔

نیلوفر پکا وعدہ کر چکی تھی کہ وہ راجہ صاحب کو ٹھکرا دے گی، مگر انھوں نے اسے ٹھکرانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انھوں نے کسی قسم کی چھچھوری خواہشیں بھی نہیں کیں۔ نیلوفر سے انھوں نے اس کی مرضی بھی نہیں پوچھی۔ بس جیسے حکم دیدیا۔ رانی صاحبہ سے ان کی عرصہ ہوا بول چال تک بند تھی، مگر بچے سب انھیں کے زیرِ سایہ پل رہے تھے۔ باوجود جسمانی خلیج کے روحانی طور پر وہ اب بھی ان سے متاثر تھے۔ انھیں علم و فضل کا خزانہ سمجھتے تھے۔ اپنی محبوباؤں کو ویسے ہی کپڑے پہناتے تھے جیسے وہ اپنی لڑکیوں کو پہناتیں۔ سوسائٹی میں وہ الٹرا ماڈرن سمجھی جاتی تھیں۔ ان کے فیشن اور ٹیسٹ کی دھوم تھی۔ راجہ صاحب نے دوسرے دن اس کے لیے نئے کپڑے بنوائے۔ چھم چھم کرتی بنارسی ساڑھیوں کی بجائے بڑے جنتائی قسم کے لبکس خریدے گئے۔ سونے اور جواہرات کے بجائے نہایت پرانے،

مگر جنہیں حال ہی میں جدید ترین تسلیم کیا گیا تھا، زیورات خریدے۔
راجہ صاحب کے ہاتھوں میں وہ بالکل کٹھ پتلی بن گئی۔ انھوں نے اسے سوچنے کا نہ موقع دیا اور نہ اس نے ضرورت محسوس کی۔ سوچنے کی اب گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟ زندگی کے سارے بھید کھل چکے تھے۔ جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ اب دیکھنا ہے یہاں سے اچھل کر وہ کس کی گود میں گرے گی۔ اور پھر ایک دن آئیگا جب وہ اچھل کر خلا میں معلق رہ جائے گی یا کسی چٹان پر گر کر پاش پاش ہو جائیگی آخر کیوں سب اس سے اتنی جلدی اکتا جاتے ہیں۔ وہ سوچتی بہت ہے اور جب وہ سوچتی ہے تو کسی نہ کسی کو برا لگتا ہے۔

اس کی خاک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجہ صاحب نے اس پر دس بارہ ہزار کیوں خرچ کر ڈالے۔ بس یونہی اس کا جی ڈر رہا تھا۔ اس نے ان سے بڑے اخلاص سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگے۔

"بھئی میں ان لوگوں میں سے نہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ میں تمہارا عاشق نہیں، دوست ہوں۔ ایسے کام میں، جس میں تم بھی خوش رہو اور نہ میرا بھی نقصان نہ ہو، مجھے روپیہ لگاتے ہوئے کیوں تکلف ہو؟"

"جھوٹ بولتا ہے نامراد۔ اکڑ دکھا رہا ہے۔" نیلوفر نے سوچا: مجھ پر رعب ڈالنے کے لئے بن رہا ہے۔ مگر وہ دس ہزار نہ بھی دیتا تو مینیجر سے وہ آسانی سے چھٹ سکتی تھی۔ ضرور کوئی راز ہے۔ مگر وہ چپ رہی۔

"میں سیٹھ کنوڈیا کی طرح انکم ٹیکس مار لینا یا ادھر ادھر گھسے دے کر کام چلانے کا قائل نہیں۔ مجھے اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔" انھوں نے

پھر اونچی سوسائٹی کا حوالہ دیا۔ "کام تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ مجھے اکیلے سفر کرتے دقت ہوتی ہے، تمہیں ساتھ رہنا ہوگا۔"

"اور رانی صاحبہ؟"

"میں کاروبار کی بات کر رہا ہوں۔ سیر سپاٹے کی نہیں۔ ضائع کرنے کو میرے پاس ایک لمحہ بھی نہیں۔"

"مگر کچھ معلوم بھی تو ہو کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"کچھ نہیں، بس ہوسٹس بننا ہوگا۔"

"مگر مجھے تو ہوسٹس بننا نہیں آتا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ تم تو پیدائشی ہوسٹس ہو۔ پھر میں جو ساتھ ہوں۔"

"مگر اس کام کے لیے تو کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی . . ."

"اجی گولی مارو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو۔ سوائے استانیاں بننے کے کسی مصرف کی نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے شکل صورت بھی چاہیے۔ ویسے مس احمد میرے ساتھ کئی سال رہی۔ کمبخت، ہر سال شادی کر کے چل دیا کرتی تھی۔ پھر تین مہینے بعد روتی چلی آرہی ہیں۔ بڑے بڑے افسروں کو پھانسنے کے لیے جال بچھانے لگی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا کہ تم بے کار شادیوں کے چکر میں پڑتی ہو۔ شادی تمہارے خون میں ہی نہیں۔ دوسرے میری بدنامی ہوتی ہے۔"

"بھلا آپ کی بدنامی کا کیا سوال اٹھتا ہے؟"

"ارے تم نہیں جانتیں۔ مجھے ان افسروں کی بیویوں سے بھی تو مراسم رکھنا ہوتے ہیں۔ وہ تو میری جان کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ یوں دوستی میں تو کچھ حرج نہیں۔

مگر اس کمبخت کو بس شادی سوار ہو جاتی تھی۔ خواہ مخواہ کے فنسیحتے کھڑے ہونے لگتے تھے۔ یہی بات میں تمہارے کان میں ڈال دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا تھا تم بھی سیٹھ کنوڈیا سے شادی پر اڑ گئی تھی۔"

"نیلوفر کھسیانی سر جھکائے رہی۔

"ویسے نہیں کہتا، مگر سچی بات یہ ہے کہ ..." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"کہیے کہیے۔ تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا یہ عورتوں کو شادی کا کیوں اتنا شوق ہوتا ہے! میں نے بڑی بڑی روشن خیال عورتوں کو دیکھا ہے، بس گھوم پھر کر شادی پر آ کر ٹکتی ہیں۔ مگر بزنس اور شادی کو گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ تم وہ نائیلون والا گاؤن پہنوگی؟" وہ ایک دم سے پٹری بدل کر دوسرے میدان میں دندنانے لگے۔

نیلوفر بھونچکی رہ گئی۔

راجہ صاحب جتنی بزنس کی باتیں کر رہے تھے اتنے سوداگر منش نہ نکلے۔ ان کا محبّت کا طریقہ عجیب وغریب تھا۔ پی کر جب وہ خوب کس گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ نیلوفر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"میں بڑا بدنصیب ہوں مجھے سب غلط سمجھتے ہیں۔ آج تک کسی نے میرے دل کی تنہائیوں کو نہیں پہچانا۔ لوگ مجھے شرابی اور عیاش کہتے ہیں۔ مگر میں ہوش میں ہوں۔ کیوں میں ہوں نا ہوش میں؟" وہ ہچکیوں کے درمیان لمبی سانسیں بھر کر پوچھنے لگے۔

اور پھر انھوں نے رو رو کر اپنے پہلے عشق کی داستان سنائی: کس طرح انھیں ایک پارسی حسینہ سے جان لیوا قسم کا عشق ہو گیا تھا۔ مگر ریاست کے مطلبی لوگوں نے اُسے اُن سے جدا کر دیا۔

"میں بہت دکھی ہوں، مجھے محبت کی ضرورت ہے۔ سچی اور بے غرض محبت کی ضرورت۔ اگر کوئی عورت چاہے تو پھر میرے دل میں جینے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ معصومہ بی بی مجھ سے پیار کرو۔" برسوں پہلے دور کسی نے آواز دی:

"معصومہ بی بی دوپٹہ سنبھال کے اوڑھو، قرآن پاک سامنے رکھا ہے۔"

"نیلوفر نے معصومہ کی طرف پیار سے دیکھا اور رو پڑی۔

"معصومہ بی بی تم رو رہی ہو؟ تمہیں میرے اوپر ترس آ رہا ہے۔"

راجہ صاحب ہچکیوں سے رونے لگے۔ معصومہ سر پر آنچل کا پلّو مارے ہل ہل کر انتیسواں پارہ پڑھ رہی ہے۔ اگلے جمعے قرآن شریف ختم ہو جائے گا۔ پھر شرح ہو گا۔ گلابی پوتھ کا پاجامہ اور بسنتی جالی کا دوپٹہ۔ اس کے پنڈے سے بگولے اٹھنے لگے۔ دادا ابّا کی بوئی ہوئی مہندی سے شعلے اٹھ اٹھ کر فضا پر چھا گئے۔

"اسکول میں جو نام تھا وہی ٹھیک رہے گا۔ معصومہ بیگم۔"

"نہیں۔" نیلوفر نے چڑ کر کہا۔ دور — اس کی دنیا سے دور — اس کی ہم جماعت لڑکیاں: فرخانہ انور علی، تہمینہ مرچنٹ، گل بانو وزیر حسن، نورا پیر حسن، معصومہ — وہ سب جدا ہو گئیں۔ وہ زندہ ہیں۔ معصومہ مر گئی اور اب وہ اس کو قبر میں سے کھینچ کر نہیں نکال سکتی۔ سفید سفید ہلتے ہوئے کیڑوں نے اب خاک بھی نہیں چھوڑی۔ نہیں اسے مت چھیڑو۔ ورنہ یہ خواب بھی بکھر

جائے گا۔ اس کی دوشیزگی کو نہ مسلو۔

مگر راجہ صاحب ضد کرنے لگے:

"نیلوفر کچھ رنڈیوں جیسا نام لگتا ہے۔ تم اس باریکی کو نہیں سمجھو گی۔ پوزیشن گر جاتی ہے۔ نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کوئی سالی ٹکھیائی ہے۔ یہ سمجھنے والے ہی سمجھ پاتے ہیں۔"

"کیا سمجھ پاتے ہیں؟"

"پولیس ایکشن کے بعد بہت سی رنڈیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ فلاں جنگ یا فلاں عہدیدار کی بہو، بیٹی یا رشتہ دار ہیں۔ میاں چھوڑ کر پاکستان چلا گیا ہے۔ یوں ٹکھیائیاں بھی شریف زادیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔"

"مگر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ لیبل کا فرق ہو، خواہ بوتل میں ایک ہی چیز ہو۔ بھی چاٹ پکوڑے سڑک پر کھڑے ہو کر کھانے کی بجائے کسی شاندار ریسٹوران میں کھا کر اور ہی لطف آتا ہے۔"

"اچھا ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو میری جان۔ ایک نہیں ہزار باتیں پوچھو۔"

"کاروبار کے سلسلے میں ... میرا مطلب ہے کیا اس سے کام چل جاتا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کیا لڑکیاں اور دعوتیں۔"

"نہیں جانم۔ توبہ کرو۔ یہ تو بس یوں سمجھو کہ ہار پھول کی طرح ہوئیں۔

دعوتیں پارٹیاں تو سب اوپری باتیں ہیں۔ ذرا مرغی گلانے کے لیے۔"

"مرغی؟"

"ہاں گلانے کے لیے تم نہیں جانتیں دنیا میں کیسا کیسا گدھا پڑا ہے۔ دو چار دعوتیں دو، اوّل درجے کی شراب ہو، حسین چھوکریاں ہوں تو انسان ذرا کھل جاتا ہے۔ راہ و رسم بڑھتی ہے، جو گہری دوستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر جب یارانہ ہو جائے تو کام بھی بنا سمجھو۔ دو چار دعوتوں کے بعد بقول کسے مرغی گل جاتی ہے۔"

"ہم نے تو سنا ہے رشوتیں دینا پڑتی ہیں۔"

"ہاں بھئی، مگر رشوتیں دینے کی بھی تو پہنچ ہونا چاہیے۔ کوئی راستہ چاہیے یوں جا کر پیسے پکڑا دینے سے کام نہیں چلتا۔ بڑے بڑے چکر چلنا پڑتے ہیں۔ کس کو کس صورت میں رقم پہنچائی جائے! کچھ ایسے ہیں جو تکلف کرتے ہیں۔ خود نہیں لیتے۔ کہہ دیتے ہیں: بھئی میری بیوہ بہن ہیں، بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں آپ جانتے ہیں میری آمدنی محدود ہے۔ بس اتنا اشارہ کافی ہے۔ ہم ان کی بیوہ بہن کے پاس کپڑوں کے تھان، زیورات کے سیٹ، موٹر گاڑی، جس کی بھی وہ بھولے سے فرمائش کر دیں، پہنچا دیتے ہیں۔"

"اور جس کی بیوہ بہن نہ ہو؟"

"ایسا کوئی ہمیں تو ملا نہیں جس کے خاندان میں کوئی بیوہ یا یتیم نہ ہو۔ بلکہ آج کل تو ایسا معلوم ہوتا ہے ان بارسوخ لوگوں کے یہاں پلٹنوں کی پلٹنیں یتیموں کی بھری پڑی ہیں۔ شاید خود ان کے بال بچے بھی یتیم ہی ہوتے ہیں۔"

"یہ لوگ پکڑے نہیں جاتے؟"

"کون پکڑے؟ زانی کو پہلا پتھر مارنے کا حق تو وہی رکھتا ہے جس نے کبھی خود گناہ نہ کیا ہو۔ ویسے ہم ایسا کچا کھیل نہیں کھیلتے۔ لینے والے بھی کوئی اناڑی نہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر بڑے شہر میں جتنے بہترین ہوٹل ہیں وہاں میرا کھاتا کھلا ہوا ہے۔ مثلاً وہاں کوئی جائے اور کہے: کمرہ چاہیے، اور اگر وہ اپنا نام "گلاب چند" بتائے تو مینیجر بغیر پوچھے گچھے اسے میرے کھاتے میں کمرہ دے دے گا۔ اب وہ چاہے جس بڑے بزاز یا جوہری کو فون کرے حاضر ہو جائے گا۔ نہ کوئی بل بنے گا، نہ رسید لی جائے گی۔ اب پکڑے سالا کوئی ماں کا لال گلاب چند کو۔"

"کمال ہے!" نیلوفر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"اس کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں لین دین کے۔ ارے بھئی جب دوستی ہی ٹھیری تو میں چاہوں تو ان کی بہو کو منہ دکھائی میں موٹر دے دوں۔ کوئی میرا کیا کرے گا؟ راجہ ہوں، کوئی ایسا ویسا کنگال تو ہوں نہیں کہ ایک ہیرے کا سیٹ نہ دے سکوں۔ یا شادی کے انتظام میں ہاتھ نہ بٹا سکوں۔ ڈیرے تنبو لگوا دیے، لائٹ کا انتظام کروا دیا، موٹریں سپلائی کر دیں، ہزار طریقے ہیں کوئی کیا کھا کر پکڑے گا۔"

"مگر بدلے میں کیا ملتا ہے؟"

"جس چیز کی ضرورت ہو۔ مثلاً: کوئی ٹھیکہ ہے۔ ڈسپوزل کا مال ہے۔ کوئی زمین چاہیے ہے۔ پچھلے دنوں ایک زمین پر بڑا مقابلہ ہو گیا۔ وہاں گرلز اسکول

ہے۔ میں نے وہ زمین اس کے مالک سے خرید لی۔ اب وہاں ایئر کنڈیشن سینما ہال بنانے کا ارادہ ہے۔ اسکول کے ٹرسٹیوں کو تو منالیا ہے، مگر وہ دو کوڑی کی ہیڈ مسٹریس فیل مچارہی ہے۔"

"پھر اب کیا کریں گے؟"

"دیکھتی جاؤ کیا کریں گے۔ وہ ہیڈ مسٹرس کرسچین ہے۔ بیس برس سے اسکول چلا رہی ہے کہ وہ کسی طرح ریٹائر ہو یا نکالی جائے، سو ممکن نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی دس سال اور کام کر سکتی ہے۔ دوسرے اس نے لڑکیوں کو ملا لیا ہے اپنی طرف۔ سیدھی طرح اگر منت کرتی تو شاید نرم پڑ جاتا، مگر وہ تو اکڑ دکھانے لگی۔ مجھے بھی ضد آگئی ہے۔ بمبئی چل کر ذرا ٹٹولنا پڑے گا۔"

"کہ مرغی گلی یا نہیں؟"

"ہاں۔" راجہ صاحب ہنسنے لگے۔

"ادرک لہسن اچھی طرح لگایا ہے؟"

"کیا؟"

"مرغی گلانے کے لیے۔"

"اوہ! ہاں، اس کی تم فکر نہ کرو۔ بس بمبئی چلو۔ ذرا ایک زوردار پارٹی ہو جائے۔ کیوں؟" انھوں نے نیلوفر کے کولھے پر دھپ مار کر کہا۔

"اوئی!" نیلوفر کھلکھلانے لگی۔ نہ جانے ایک دم اس کی چھاتی کا بوجھ کہاں غایب ہو گیا: آپ ہی آپ قہقہے اُبلنے لگے، جیسے امتحانوں کا نتیجہ آگیا ہو

کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی۔ دوسروں کے تو اس سے بھی کم نمبر تھے اور بڑی بڑی ڈگریاں دبائے بیٹھے تھے۔ وہ اتنی بری بھی نہیں۔

اس بات پر اس نے خوب دل کھول کر پی اور بزنس کو بھول کر اس نے راجہ صاحب کو جی بھر کر پیار کیا۔ ایسے کہ وہ فلم، جنھیں دیکھ کر اُسے قے ہوگئی تھی، کچھ دھندلے پڑ گئے۔

راجہ صاحب کی صحبت میں نیلوفر نے دنیا کے نئے نئے روپ دیکھے۔ ہر روپ سیاہی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھا۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے گناہ کے سمندر میں وہ تو صرف ایک ننھی سی بوند ہے۔ سب ہی اس سے کچھ کم، کچھ زیادہ مجبور ہیں۔ بڑی مستعدی سے خود اپنے پیروں میں ڈھال ڈھال کے بیڑیاں جکڑ رہے ہیں۔ گناہ جب ضرورت زندگی کی صورت اختیار کر لے تو پھر گناہ نہیں عقل و دانش کا تقاضا بن جاتا ہے۔ جس حمام میں سب ہی ننگے تھے وہاں اسے اپنے برہنہ پن سے کیوں تکلّف محسوس ہوتا۔ چند ہی مہینوں میں اس نے اپنی قیمت کئی بار دگنی تگنی ادا کر دی۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، دہلی، غرض ہر بڑے شہر میں میں راجہ صاحب کی دعوتیں، محفلیں کامیاب رہیں۔

زبیدہ کی شادی

دہلی میں اسے ممی کا خط ملا۔ وہ زبیدہ کے لیے لڑکا دیکھنے گئی تھیں۔ زبیدہ بی اے، کے آخری سال میں تھی۔ انھوں نے کئی لڑکوں کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ مختلف مانگیں ہیں ان کی۔ جیسا گدھا ویسے دام۔ زبیدہ کی شادی کے ذکر سے نہ جانے دل کے کس حساس کونے میں ٹھوکر لگی۔ معصومہ نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔ ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ کیا وہ اپنی بہن سے جل رہی تھی؟

اس کی پاک صاف زندگی پر رشک آرہا تھا۔ قطعی نہیں۔ اسے زبیدہ سے ہمیشہ سے محبت تھی۔ وہ بھونڈی سی تھی۔ پڑھنے کی شوقین تھی۔ اسے پڑھا لکھا کر نیلوفر کو بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ کچھ اپنی زندگی کی محرومیوں کی تلافی ہو جاتی تھی اس نے ممی کو لکھ دیا کہ بے تکلف اونچے داموں کا مال زبیدہ کے لیے تلاش کریں۔ کوئی کسر اٹھا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ خط لکھ کر اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ اس رات اس نے بڑے اونچے اونچے قہقہے لگائے اور بڑا ہنگامہ کیا۔ راجہ صاحب بار بار اسے ٹھوکے دے رہے تھے، کیونکہ وہ گوہر مقصود، یعنی ایک نہایت ہی اہم ہستی پر توجہ دینے کی بجائے ایک شاعر صاحب کے پہلو میں گھس رہی تھی، جو چپکے چپکے اس کے کانوں میں غلیظ اشعار ٹپکا رہے تھے۔ اسے گوہر مقصود کی گنجی کھوپڑی اور چکنے گھیا جیسے لنڈ منڈ چہرے سے ابکائی آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور ناک کی پھننگ ایسی سرخ ہو رہی تھی جیسے وہ ابھی رو کر آیا ہے یا کسی کو رونے جا رہا ہے۔ "ارے بھائی کرنل صاحب کو ذرا بوٹی کباب چکھاؤ۔ دیکھو تو ان کا گلاس خالی پڑا ہے۔ ذرا کرنل صاحب کو لطیفہ تو سناؤ۔ وہ بانڈ روم کا، جو تم نے اس دن سنایا تھا تو ہنستے ہنستے پیٹوں میں بل پڑ گئے تھے۔" وہ بار بار اسے گھیر کر ڈربہ میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کرنل صاحب سخت ٹائٹ ہو رہے تھے اور اسپر پلپے پڑ رہے تھے۔ زبردستی الٹا اس کی خاطر پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے گلاس میں برف ڈالتے ہوئے نشانہ چوک گیا اور برف کی ڈلی نیلوفر کے کندھوں پر سے ڈھلکتے ہوئے گریبان میں جھونک دی۔ نیلوفر کے چیخنے پر بوکھلا کر جو

برف پکڑنے کے لیے ہاتھ ڈالا تو برف تو پھسل کر نیچے سے نکل گئی۔ ہاتھ انگاروں پر پڑ گیا۔ نشہ میں بیلو فر کو یاد نہیں اس نے کیا کیا۔ پوری محفل برف کے ٹکڑوں کی تلاش میں ہاتھ سینکنے لگی

صبح جب آنکھ کھلی تو کسی اجنبی ہوٹل کا کمرہ تھا۔ پاس ہی تکیے پر سیمرغ کا انڈا رکھا تھا۔ مگر بیچوں بیچ سے تڑخا ہوا تھا، جیسے اندر سے بچّے نکلنے کے لیے کھٹکی لگائی ہو۔ بڑی دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس جنگل بیابان میں ہے۔ مگر اتنے میں انڈا گھوما اور چھلی ہوئی اروی نے سونے منڈھے دانت نکوس دیے۔

"اوہ!" اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔"

"مس جنگ مجھے بڑا افسوس ہے۔"

"آپ نے جان بوجھ کر مجھے اتنی پلائی تھی۔" اس نے ناٹک شروع کیا۔ حالانکہ بے چارے نے قطعی نہیں پلائی تھی۔ "آپ... آپ۔" وہ ہکلا کر رہ گئے۔

"آئی وانٹ ٹو ڈائی۔"

"پلیز۔ ڈارلنگ۔"

"مجھے ٹیکسی منگوا دیجیے۔"

"گاڑی موجود ہے۔ مگر..."

"آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے؟" اس نے ران پر رینگتا ہوا ہاتھ دور جھٹکا۔

"او مائی گاڈ۔ لسن پلیز۔" حالانکہ کرنل صاحب سمجھتے تھے کہ وہ کون ہے،

مگر اس کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ہتک محسوس ہوتی تھی۔ کتنی طمانیت تھی اس احساس میں کہ انھوں نے ایک اونچی سوسائٹی کی لڑکی کو خراب کیا۔

"آئی ایم اے سوائن!" انھوں نے فخر سے سینہ پھلالیا۔

وہ اوندھی پڑ کر سسکیوں سے رونے لگی۔ اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ بغیر آنکھ میں انگلی مارے آنسو خود بخود نکل آئے۔ واقعی ہچکی بندھ گئی۔ کیوں؟ اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ کرنل صاحب نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا، تب تو اسے ہنسی آجانا چاہیے تھی، مگر کوئی قابو سے باہر، زبردست طاقت اس کے وجود میں رو رہی تھی۔ جب طوفان رک گیا اور بادل چھٹ گئے تو تازہ نیبو کا رس پیتے ہوئے اسے معلوم ہوا وہ اشوک ہوٹل میں ہے۔ "مائی گاڈ! کیا غصہ ہے۔" کرنل صاحب نے پیار سے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ میدان جنگ میں انھوں نے بڑے بڑے زخم کھائے تھے۔ ان کی وردی تمغوں سے بھری پڑی تھی۔ اتنا حسین زخم، اتنی حسین محبوبہ نے شاید اس سے پہلے انھیں نہیں بخشا تھا۔ جب ہی تو وہ میٹھی میٹھی آنکھوں سے اسے تک رہے تھے۔ اور بجائے روٹھنے کے احسان مند نظر آرہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ میجر تو ضرور رہے ہوں گے، کیونکہ نہ صرف ان کی کھوپڑی گنجی تھی بلکہ گدّی پر بالوں کی جھالر بھی قریب قریب سفید تھی۔ گالوں پر بھی چیونٹی کے انڈے پھوٹ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں نیلوفر اداس ہوگئی۔ اس کے نصیب میں یہ اترے ہوئے آم کیوں لکھے تھے؟ کیا زندگی میں ایک بار بھی وہ جوان نابوں کے حلقے میں

نہ جھوم سکے گی؟ احمد بھائی سے لے کر کرنل صاحب تک، سب ہی اس سے عمر میں دگنے یا ڈھائی گنے تھے۔ ایک دم اسے پونا کا ٹیکسی ڈرائیور یاد آگیا۔ وہ مزدور نوجوان ہوگا۔ کاش وہ اتنی مدہوش نہ ہوتی!

وہ ناشتے پر ہی تھے کہ راجہ صاحب آگئے۔

"آداب عرض! کہیے حضور مزاج تو اچھے ہیں۔ آداب عرض۔" وہ بالکل چھوٹے دیور کی طرح نیلوفر سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ "آپ لوگ تو پارٹی سے ایسے غائب ہوئے کہ ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ پھر تو پارٹی ہی اکھڑ گئی اچھا ہمیں بیوقوف بنایا۔"

وہ جاکر بالکنی میں کھڑی ہوگئی اور راجہ صاحب باتوں میں غرق ہوگئے۔ کچھ مشینوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ نیلوفر کو یاد آیا کہ راجہ صاحب کا ایک کارخانہ ہے یہاں تالوں کے علاوہ موٹروں کے کچھ سپیئر پارٹ، اسٹوو، ٹفن کیریر وغیرہ بنتے ہیں۔ شاید کسی بڑے کانٹریکٹ کی تاک میں ہیں۔

نیچے لان پر آیائیں بچوں کو لیے ٹہل رہی تھیں۔ ایک سانولی سی بچی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے اپنی بیٹی یاد آگئی۔ کیا نام تھا اس کی بیٹی کا؟ بالکل ذہن سے اتر گیا۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس نے سیٹھ کی بیٹیوں کے وزن پر اس کا نام اوشا رانی رکھنا چاہا تھا۔ نہ جانے کیوں سیٹھ جی کھسیانے سے ہوگئے تھے۔ وہ اس بچی کو شیلا رانی، پشپا رانی اور اندرا رانی کے سلسلے کی کڑی بنانے کو تیار نہ تھے۔

اب تو اس کا نام فیروزہ بانو رجسٹر کروا دیا گیا۔ فیروزہ نام کی لڑکی سے

انھیں کم سنی میں عشق ہو گیا تھا ۔ لاہور چلی گئی تھی ۔ اب تو شاید نائیکہ ہو گی ٹھسّے والی ۔
نیلوفر کا جی کھٹا ہو گیا تھا ، اس لیے وہ ہمیشہ اس کا نام بھول جایا کرتی تھی ۔
اس بھونڈی سی بچّی پر ترس آیا تھا جو بے کرایہ کے مہمان کی نو مہینے زبردستی اس کی کوکھ میں رہی تھی ۔ اگر بیٹا ہوتا تو شاید سیٹھ اتنی جلدی ناتہ کاٹ دیتے ۔ اس نے سیٹھ کو اپنے دل کا ایک کونہ دیا تھا ، مگر جب سے وہ خالی ہوا تھا اجڑا محل ڈھنڈار پڑا تھا ، جیسے دل کی جگہ صرف خلا رہ گیا ہو ۔ نہیں اب وہ کسی کو ٹوٹا پھوٹا کونا بھی نہیں دے گی ۔

" ویسے لوکل مارکیٹ تو نہیں کے برابر ہے ۔ اوپر سے ان حرام زادوں نے اپنا جال پھیلا رکھا ہے ۔ "

راجہ صاحب کاروباری باتیں سمجھا رہے تھے : " گھروں میں چھوٹی چھوٹی بھٹیاں لگا لی ہیں ۔ "

" مگر اس سے آپ کے کارخانے پر کیا اثر پڑتا ہو گا ؟ "

" نہیں صاحب ، کافی اثر پڑتا ہے ۔ یہ کاٹج انڈسٹری اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے ۔ کتنا مزدور کھپ جاتا ہے ، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ چھوٹے چھوٹے دیسی اداروں سے تالوں کے پرزے وغیرہ گھسنے کا کام ہے ، جو گھروں میں بیٹھنے والی عورتیں بھی دن میں گھر کے کام کاج سے وقت نکال کر کر لیتی ہیں ۔ ان بھٹیوں میں پرزے ڈھلتے ہیں پالش کرنے کے لیے لوگ لے جاتے ہیں ۔ بڑی کم مزدوری میں کام چل جاتا ہے ۔ ذرا غور کیجیے ، کتنا مزدور کٹ جاتا ہے ۔ "

" آپ کو کیا لیبر کی کمی ہے ؟ "

"ایسی خاص آسانی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ گھر بیٹھنے والی عورتیں کارخانوں میں نہیں جا سکتیں، اس لئے وہ تو ویسے ہی ہاتھ سے گئیں۔ دوسرے یہ چھوٹے کارخانوں والے انھیں اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ ہم سے بائیکاٹ کرا رکھا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کہہ کر ڈرا رکھا ہے کہ یہ لوگ تم سے مفت میں محنت لیں گے۔ تمہاری سنوائی نہیں ہوگی۔ پھر وہی پارٹ ٹائم کی لالچ ہے۔ سارا دن حاضری دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم لیبر کو آرگنائز نہیں کر سکتے۔ پابندی سے یہ لوگ بھڑکتے ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو، زہر بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ پھیری والوں کی طرح گھر گھر لالٹینیں، چولھے اور تالے وغیرہ بیچتے پھرتے ہیں۔ سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی دکانیں لگا لیتے ہیں۔ سارے مارکیٹ پر چھائے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان سالوں کا کیسے مقابلہ کریں۔ کتنی دکانیں کھول سکتے ہیں۔ مفت کی دردِ سری ہے اور پھر ہماری بڑی دکان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ یہ چھوٹی دکان والے ظاہر ہے سستی چیزیں بیچتے ہیں۔"

"خواہ آپ کے مقابلے میں کوڑا ہی ہوں؟"

"اور کیا — ان لوگوں میں اتنی عقل کہاں کہ مہنگی اور پائیدار چیز کی قدر کریں دس بار خریدنا پڑے پر سستی ہو۔ عجیب ذہنیت ہے۔ اس کے علاوہ جو ایک فرقے کے دل میں دوسرے فرقے کے خلاف بغض کا بیج بویا جاتا ہے، مجھے تو اس پر اعتراض ہے۔"

"کیا ردی مال بیچنے کے جرم میں ان لوگوں کو پکڑا نہیں جا سکتا؟" کرنل صاحب جمائی لے کر بولے۔ "نہیں صاحب یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ ان لوگوں کو سرکاری لائسنس دے دیے گئے ہیں۔ اور مال بھی ان کا برا نہیں ہوتا۔ دراصل

یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے کارخانوں میں مستری کا کام کر چکے ہیں۔"

"یہ کارخانہ تو عرصے سے بند پڑا تھا۔"

"جی ہاں۔ نواب صاحب سے میں نے خرید لیا۔ سب کوڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اتنا سرمایہ جھونکا ہے کہ کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ تمام نئی مشینری لگوائی۔ ٹریڈنگ اسٹاف رکھا۔ صاحب آخر ہمارے گذارے کا بھی تو انتظام ہونا چاہیے۔ کیا ہم سے ریاستیں چھیننے کے بعد روزی بھی حلق سے نکال لینے کا ارادہ ہے؟ ہم جہاں بھی سرمایہ لگاتے ہیں مشکلیں آن پڑتی ہیں۔ بالکل ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں قانون نے۔ پولیس بھی ان کا ہی ساتھ دیتی ہے۔ اور پھر کہتے ہیں: سرمایہ نایاب ہے۔ ہمارا کیا ہے صاحب؟ ہماری بلا سے۔ ہمارا روپیہ لاکر میں پڑا رہے، محفوظ تو رہے گا۔ ملک کی اننتی کے لیے لگاؤ تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کنگال ہو جاؤ۔ اگر کوئی فیصلہ نہ ہوا تو میں یہ کارخانہ اونے پونے بیچ کے انگلینڈ مائیگریٹ کر جاؤں گا۔ بلا سے، دو نوالوں کا سہارا تو رہ جائے گا۔"

"ارے ہاں خوب یاد آیا۔ وہ جو آپ نے پاٹ منگوایا تھا، اس کا کیا بنا؟"

"ہے۔ کسی دن چلیے نا، جمنا میں پیر رہے۔ ذرا دیکھیے تو، آپ کو پسند ہو تو . . ."

"نہیں صاحب میرے پاس اتنے پیسے . . ."

"کیسی باتیں کرتے ہیں؟ آپ مجھ سے ایسی غیریت برتتے ہیں بھگوان قسم! مجھے تو اس کا رنگ پسند بھی نہیں۔"

"رنگ تو بہت خوبصورت ہے۔"

"بس سبز رنگ مجھے راس نہیں آتا۔ ویسے آپ کا لکی اسٹون کیا ہے؟"

"زمرّد ہے، اس کے ساتھ ہیرا بھی چل جاتا ہے۔"

"زمرّد! یعنی کمال ہے، سات پشتوں سے زمرّد ہمارے ہاں راس نہیں آتا۔ دیکھیے ایک عرض ہے، اگر میری دلشکنی منظور نہیں تو ..."

"نہیں بھئی۔ یہ کیا کرتے ہیں آپ؟" کرنل صاحب ہنسنے لگے۔

"کرنل صاحب یہ نہ سمجھیے گا کہ میں ان چیزوں کو بھی حساب میں لگا لوں گا۔ یہ تو میری آپ کی دوستی کی بات ہے۔ ویسے صاحب میں لالچی نہیں۔ قوم اور ملک کی خدمت کا شوق ہے۔ ملک انڈسٹریلائز ہو گا تو کیا صرف ہمارا فائدہ ہو گا؟ ملک کی مجموعی دولت نہ بڑھے گی؟ پھر کیا ہم اور آپ غیر ملکی ہیں؟ ہمیں بھی گذارے کیلیے کچھ تھوڑا بہت ملنا چاہیے۔ آپ جیسا شخص، جس نے ساری زندگی ملک پر نچھاور کر دی، اپنے خون سے اسے سینچا، کیا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا؟ آپ کی قابلیت کا کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کہاں پہنچا ہوتا۔ سالے دھنیے جلاہے گورنر بنائے جا رہے ہیں۔ کیا دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ لیکن آپ کو کیا ملا؟ وہی بندھی ہوئی تنخواہ! صاحب آج کل کسی شریف انسان کو گذارے کے لائق تنخواہ ملتی ہے؟"

نیلوفر دنگ رہ گئی۔ راجہ صاحب کو اس نے زیادہ تر حکم چلاتے دیکھا تھا، مسکہ لگاتے آج دیکھا۔ کارخانے کی طرف سے واقعی بڑے فکرمند نظر آ رہے تھے کچھ دنوں سے۔ وعدہ کیا تھا کہ میرا کام ہو جائے تو کارخانے کی آمدنی میں سے تمہیں ہیرے کا سیٹ خرید دوں گا۔ زبیدہ کے جہیز کا کچھ تو انتظام کرنا پڑے گا۔

دولھا کو جوڑے گھوڑے کے بیس ہزار سے کیا کم دینے ہوں گے۔ پڑھا لکھا اونچے خاندان کا لڑکا اتنے میں مہنگا نہیں۔

اس کا خیال تھا اب راجہ صاحب اسے ساتھ لیتے جائیں گے۔

"ذرا ایک ضروری کام سے جانا ہے، تم واپسی میں چلی چلنا۔" انھوں نے آہستہ سے بالکنی میں جھانکنے کے بہانے پاس آکر کہا۔

"میرے کپڑے سارے میلے گئے۔"

"موٹر میں اٹیچی لیتا آیا ہوں، ابھی بیرے کے ہاتھ بھیجتا ہوں۔"

اٹیچی میں ضرورت کی ہر چیز نہایت سلیقے سے موجود تھی۔

"بڑا بدصورت ہے۔" نیلوفر نے شکایتاً راجہ صاحب سے کہا تھا۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں جانِ من۔ میں نے اس کا اس پوزیشن پر تقرر نہیں کیا۔ اور بھئی میرا کام کروا دے تو مجھے حور کا بچہ معلوم ہونے لگے گا۔"

قدرت کے کھیل دیکھیے کہ ایک دن جس معصومہ کو پیٹ کی خاطر نیلوفر بننا پڑا تھا وہی نیلوفر پھر سے چولا بدل کر معصومہ بن گئی۔ کام نہ سہی نام تو بدلا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کئی سیڑھیاں وہ واپس چڑھ آئی اور اگر حالات یونہی سازگار رہے تو وہ بہت جلد سچ مچ دوشیزہ بن جائے گی۔ اس کا بھٹا ہوا گریبان سل جائے گا۔ اور آنکھوں کی حیا واپس لوٹ آئے گی۔ کئی پارٹیوں میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اس کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ سب کے ناموں کے ساتھ معصومہ جنگ کا نام دیکھ کر اس کے دل میں اس نئی ہستی کے لیے بڑی عزت

پیدا ہو گئی تھی۔ اس جیسی بہت سی سوسائٹی کی معزز خواتین ہیں جن کے بارے میں اوٹ پٹانگ قصے اڑتے رہتے ہیں، مگر اس سے ان کے وقار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ درمیانہ طبقہ کا چھچھور پن یہاں اثر انداز نہیں ہوتا۔ اگر کسی خاتون کی دوستی ہے تو لوگ اس سے خاصا مرعوب نظر آتے ہیں۔ کرنل صاحب گو ریٹائر ہو چکے ہیں، انھوں نے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ بڑے اور اہم عہدیداروں سے گہرے مراسم ہیں۔ کوئی اہم پارٹی ایسی نہیں ہوتی جہاں یہ چند معزز اصحاب نہ ہوں۔ اور امید ہے کہ اگر اسی طرح وہ سرکار کی مخالفت میں لکچر اور بیان دیتے رہے تو جلد ہی کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا کسی ملک کے سفیر بنا دیے جائیں گے۔ پچھلے الیکشن میں بھی وہ کھڑے ہوئے تھے، مگر آخر میں انھوں نے اپنا نام ایک زبردست اور اونچی حیثیت کی پارٹی کے حق میں واپس لے لیا تھا۔

"مگر آپ تو کہتے ہیں الیکشن میں بہت روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے۔" اس نے راجہ صاحب سے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر انھیں سارا خرچ مل گیا۔ بلکہ اوپر سے فائدہ بھی ہو گیا۔ ووٹ پکڑنے کے لیے دو چار آسامیاں تو کھڑی کرنی ہی پڑتی ہیں۔ پھر کسی بھی پارٹی سے معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ بہت لوگوں کا تو ذریعۂ آمدنی ہی یہ ہے۔"

"تو یہ جو لڑکے آپ نے بلائے ہیں یہ بھی الیکشن کے سلسلے میں بلائے ہیں؟"

"ہاں۔ یہی سمجھو۔"

"اتنے لوگ ٹھیریں گے کہاں؟"

"اپنی کوٹھی کے علاوہ دو اور کوٹھیوں کا انتظام کر لیا ہے۔ کھانے کا انتظام

ڈیروں میں رہے گا۔ برتن وغیرہ گنوا لیے ہیں؟"

"جی ہاں۔ گلاسوں کی کمی پڑے گی۔"

"میں نے ان کا انتظام کر لیا ہے۔"

نیلوفر ایک دم کچھ سوچنے لگی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی کہ کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"نہیں جی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ پولیس کا پکّا انتظام ہے۔"

"ہاں... مگر..." وہ چپ ہو گئی۔

"تمہیں تکلیف ہو رہی ہو تو بمبئی ہو آؤ۔ تمہاری بہن کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

"دسمبر میں۔"

"تو چلی جاؤ کچھ انتظام کرنا ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔ بھلا ایسے موقع پر کیسے جا سکتی ہوں۔ یونہی مجھے خیال ہوا۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"کیا رسانیت سے نہیں ہو سکتا؟"

"سیدھی انگلی گھی نکلتا تو اس ہنگامے کا کیا مجھے شوق ہے؟"

"مگر کیسے گدھے ہیں یہ لوگ۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ آپ انھیں اپنے کارخانے میں نوکری دینے کو کہتے ہیں، پھر بھی نہیں مانتے۔ دماغ خراب ہوا ہے کمبختوں کا۔"

"تو پھر تمہارے لیے سیٹ رزرو کروا دوں ؟"

"کیوں ؟ ارے نہیں ۔ میں تو ۔ ۔ ۔"

"کیوں ؟ کیا کچھ ہنگامے کا ڈر ہے ؟"

"نہیں نہیں ۔ ہنگامہ ہوگا بھی تو تمہارا بال بیکا نہ ہوگا ۔ میں سوچ رہا ہوں میں بھی چلا چلوں ۔ کیوں منشی جی آپ کو تکلیف تو ہوگی نہ ؟"

"نہیں سرکار ۔ آخر تین پشتوں سے نمک جو کھایا ہے ۔ اگر میری کھال کی جوتیاں بھی بنا کر حضور پہن لیں تو میری خوش قسمتی ہوگی ۔"

"پھر بھی بال بچوں والے آدمی ہو ۔"

"حضور میں نے سب کو سیتاپور بھیج دیا ہے ۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں ۔ ان سالوں کی بساط ہی کیا ہے ؟ بھوسہ بھر دیں گے جی ۔"

"بھئی خون خرابے سے ڈر لگتا ہے ۔ انھیں سمجھایا نہیں جا سکتا ؟"

"بہت سمجھایا بائی جی ۔ سالے کہتے ہیں سب کو نوکریاں دو ۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ جتنے کاریگر، جو مستقل ان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، انھیں بھی نوکری دو، اور وہ جو پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں انھیں بھی ۔ سالے گھٹنے گھنائے بڈھے بڈھیاں بھی ساتھ میں چپکے ہوئے ہیں ۔ کہتے ہیں ان کی روزی ماری جائے گی ۔ یہ کہاں جائیں گے ۔ کہو : بھئی کیا ہم نے ساری دنیا کا ٹھیکہ لیا ہے ۔ ہم نے کارخانہ کھولا ہے یتیم خانہ نہیں کھولا ۔ ذرا سوچیے اس طرح ملک انڈسٹریلائز ہو سکتا ہے ؟"

"یہ نیتا لوگ کچھ نہیں کرتے؟" نیلوفر نے بڑبڑائی۔

"ارے بھلی چلائی ان نیتاؤں کی۔ اپنی بھٹی جھونکنے سے فرصت ملے تو دوسروں کی مشکلات پہ نظر پڑے۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں' اپنوں ہی اپنوں کو دے۔ ساری رعایتیں ہیں تو پہلے اپنے کنبے کے لیے' پھر اپنے صوبے والوں کے لیے' بچتا کیا خاک ہے جو ہمارے ہاتھ آئے۔ پھر دنیا بھر میں سرخرو بھی تو بننا ہے کہ بڑا جنتا کا پالن ہو رہا ہے۔ سوائے ہمارے سب کوڑا کرکٹ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے۔ کہو: ہمیں مار کے تمہیں کیا مل گیا اور آیندہ کیا مل جائے گا؟" کوئی منچلا اٹھا' اسمبلی میں داغ دیا کہ کاٹج انڈسٹری کو ترقی دو۔"

"کمال ہے صاحب!" منشی جی بولے۔

"جی ہاں۔ انھیں لون دینے کی اسکیمیں بن رہی ہیں۔ مطلب یہ کہ بجائے اس کے کہ گھاس بکرے کو ملے' بکرا کاٹ کر گھاس کو کھلا دیا جائے۔ منشی جی آپ ٹکٹوں کا انتظام کیجیے۔"

نیلوفر کی سمجھ میں اور کچھ نہیں مگر اتنی بات تو آگئی کہ وہ لوگ' جو راجہ صاحب کے کارخانے کی ترقی میں حائل ہیں' ملک اور قوم کی ترقی کے دشمن ہیں؛ راجہ صاحب کے دشمن نیلوفر کے دشمن ہیں؛ اس چندن ہار کے دشمن ہیں جو کامیابی اور خوش اسلوبی سے کام ہو جانے کی صورت میں راجہ صاحب اسے دینے والے ہیں؛ وہ چاہتے ہیں زبیدہ کو اچھا بر نہ ملے' وہ بھی نیلوفر کی طرح برباد ہو؛ سارا خاندان تباہی کے غار میں ڈوب جائے!

"کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔" اس نے راجہ صاحب کو اپنے عملے کو احکامات

جاری کرتے سُن کر اطمینان کا سانس لیا۔

اب زبیدہ کی شادی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے گی۔ تاج میں بوفے ڈنر، اسٹیڈیم میں ریسپشن — ایک دفعہ دولھا والوں کی آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

"آپ اطمینان سے بمبئی پدھاریے سرکار۔ مگر وہ لوگ کل تک پے منٹ کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر پرسوں بینک بند ہوگا۔"

"کل تمام پے منٹ ہو جانے چاہئیں۔ عین وقت پر کوئی اڑچن نہ پڑے۔ معاملہ نازک ہے، ذرا سی بھی لاپرواہی ہوگئی تو سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔"

"دلّی موٹر سے جائیں گے سرکار؟"

"ہاں۔ میرا یہاں نہ رہنا ہی ٹھیک رہے گا۔ جو کچھ ہو میری غیر حاضری میں ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں سرکار۔ اگر آپ ہوتے تو مجال تھی جو کچھ ہو جاتا۔" منشی جی شرارت سے مسکرائے۔

"روپیہ لاکر سے آج ہی نکلوا لیں گے۔ ایسے موقعوں پر کوئی فیکٹری کے کام کے لیے بھی چیک نہیں تڑانا چاہیے۔ تفتیش کے وقت یہ لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر پریشان کرتے ہیں۔ ویسے میں نے سب ہی کو خوش کر دیا ہے۔ ہم اشوکا میں ٹھہریں گے۔ اگر اِدھر اُدھر کہیں دعوت میں ہوئے تو ہمیں اطلاع پہنچ جائے گی۔"

"جی ہاں حضور: گلاب کی قلمیں پھل گئیں!" منشی جی مسکرائے۔

"اور اگر کچھ گڑبڑ ہو جائے تو ؟"

" قلمیں سوکھ گئیں، حضور ذرا بھی ڈھیل ہو جائے تو جو چور کی سزا سو غلام۔ آ... وہ... میں..." منشی جی مؤدب انداز میں فکرمند ہو گئے۔"

"ہاں ہاں کہو۔ تمہارے گھر کا روپیہ ادا ہو گیا ؟"

"جی وہ تو آپ کی عنایت سے ہو گیا۔ میرے بال بچے حضور کے اقبال کو دعائیں دیں گے ساری عمر۔ وہ آپ کی کنیز کی رخصت ہے۔ بس دو منٹ کے لیے تشریف لے آتے تو میری عزت کو چار چاند لگ جاتے۔"

"تم جانتے ہو ہم اتنی جلدی واپس نہیں لوٹ سکتے۔ جوہری صاحب کو ہم دہلی سے ـــــ ہدایات دے دیں گے۔ وہ سیٹ بھیج دیں گے۔"

"حضور ہم غریبوں کے ہاں جہیز میں وہ سیٹ تو جیسے ٹاٹ میں زربفت کا پیوند معلوم ہو گا۔ ویسے شادی اگر دھوم دھام سے نہیں بس سیدھی سادی طرح نمٹ جائے تو..."

"تم کیش چاہتے ہو ؟ اچھا ہو جائے گا اس کا بھی انتظام۔"

جب منشی جی دعائیں دیتے رخصت ہو گئے تو راجہ صاحب بولے: ایک حرامی ہے۔"

"کون ؟" نیلوفر چونک پڑی۔

"یہی منشی کا بچہ۔ کیش چاہیے۔ بھروسہ نہیں ہمارے اوپر۔"

"اور آپ ہیں کہ اس کے ذمے اتنا اہم کام سونپ دے رہے ہیں۔ نکال باہر کیوں نہیں کرتے سؤر کو ؟"

"تم نہیں سمجھتیں معصومہ بی بی ۔ 'اہم' کاموں کے لیے حرامزادوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اچھا آج ذرا ہو جائے ۔ تم اپنا وہ جوڑا پہنو ۔ وہ بنفشی والا ۔ آج ہم بڑے مزے میں ہیں ۔"

انہوں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ نیلوفر کو معلوم ہوا کہ وہ ایک رنڈی ہے۔

"اُنہہ، چولھے میں جائے!" اس نے سوچا نہ جانے وہ کسے چولھے میں جھونک رہی ہے ۔ ان گلاب کی قلموں کو جو لگائی جانے والی تھیں، معصومہ بی بی کو یا ساری کائنات کو؟

ساری رات قوالی کی محفل جمی رہی ۔ شہر کے عمائدین جمع تھے ۔ پچھلے کمرے میں نائے ونوش کا بھی انتظام تھا ۔ بڑے بڑے افسر، قومی رہنما، شاعر، ادیب جھوم جھوم کر داد دیتے رہے ۔ ایک طرف پردہ دار بیویوں کے لیے چقیں پڑی تھیں ۔ نیلوفر بنفشہ کے تر و تازہ پھول کی طرح اندر باہر ہوسٹس بنی پھر رہی تھی ۔ بیویاں آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں :

"دلی کی نوبہار کی بیٹی ہے ۔"

"بمبئی میں فلم ایکٹرس ہے ۔"

"نہیں جی بڑے اونچے گھرانے کی لڑکی ہے، آوارہ ہو گئی ۔ راجہ صاحب پر دل آگیا ۔ گھر بار چھوڑ کر بھاگ آئی ۔"

بیویاں کھسر پھسر کرتیں، مگر نیلوفر کو قریب آتے دیکھ کر کہنے لگتیں :

"اے بہن آپ تو یکساں گھوم رہی ہیں ۔ بڑی تکلیف ہوئی آپ کو ۔"

نیلوفر چنا ہوا شفون کا دوپٹہ ایڑیوں سے گھسٹتی، کہنیوں تک ڈھیلی

کار گے کی آستین سنبھالتی دم بھر کو بہنوں کے جھگڑے میں بیٹھتی، پھر اٹھ کھڑی ہوتی۔

"بہن ذرا گلوریاں بھجوادوں، ابھی حاضر ہوئی۔" اور وہ پھر محفل میں جا بیٹھتی۔

فارسی اور اردو کی قوالیوں پر سامعین سر دھن رہے تھے۔ راجہ صاحب کو شعر و ادب سے عشق تھا۔ محفل ختم ہوتے ہی وہ کار سے روانہ ہونے والے تھے اور بار بار یاد دلا رہے تھے۔

نیلوفر جو سوڈا دیکھنے پچھلے کمرے میں گئی تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پچھلی طرف لان پر کوئی پچاس ساٹھ سٹوڈنٹ مع سامان کے لاریوں سے اتر رہے تھے۔ منشی جی انھیں چھولداریوں میں لے جا رہے تھے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر ادھر کمرے کی طرف متوجہ تھے۔ "ادھر آیئے۔ آپ کے لیے اس چھولداری میں سارا انتظام ہے۔" وہ انھیں سب سے الگ چھولداری میں لے گئے، جہاں مالی سوڈے کی بوتلوں کا بکس لے جا رہا تھا۔

"یہ چھولداریوں میں کون لوگ ٹھہرائے جا رہے ہیں؟" اس نے راجہ صاحب کو قوام کی گولی دیتے ہوئے پوچھا۔

"ودیارتھی ہیں۔ آگرے سے تاج محل دیکھ کر لوٹ رہے تھے،" منشی جی نے کہا انھیں ایک رات ٹھہر لینے دیا جائے۔"

"اے ہے کمبخت ڈاکو لگ رہے ہیں بالکل۔"

"اور میں کون لگ رہا ہوں؟ میں بھی تو حسن کا ڈاکو ہوں۔ قسم سے آج

غضب کا نکھار ہے۔" راجہ صاحب نے شرارت سے اس کی چھنگلی میں چٹکی لی۔

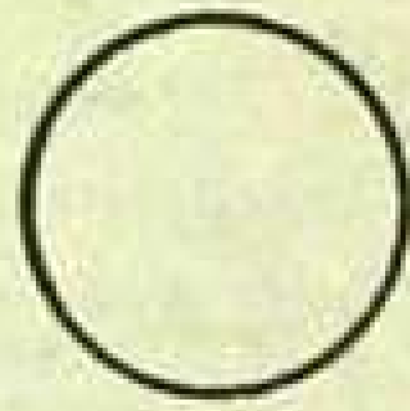
کوئی ڈھائی تین بجے مہمان رخصت ہوئے۔ ابھی کچھ لوگ جا ہی رہے تھے کہ راجہ صاحب مع نیلوفر اور چپڑاسی کے اسٹیشن ویگن میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے تاکہ سند رہے کہ وہ تو پہلے ہی چل دیے تھے۔

نیلوفر نے اپنا تھکا ہوا سر سیٹ کی گدی پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ارے بھئی سونے کی شرط نہیں۔" راجہ صاحب نے بٹن دبایا۔ سامنے کی سیٹ میں چھوٹی سی بار کھل گئی۔

"بھئی بہت تھک گئے۔" وہ نیلوفر کی گود میں نیم دراز ہو گئے۔

پانچواں باب



وہ رو رہی ہے۔ ہولے ہولے خاموشی سے رو رہی ہے۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں کھویا ہوا ہے۔ سر جھکا ہوا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ رو رہی ہے، ڈر رہی ہے، کیونکہ اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں میں ستاروں کی جوت نہیں، جو اتنے کالے، اتنے دبیز اندھیرے میں چمک سکیں۔ کوئی آرہا ہے۔ اس کے پیچھے دبے پاؤں۔ کوئی غیر مرئی ہیولا۔ بجبجاتا ہوا عفونت کا ڈھیلا ڈھیلا سیاہ انبار۔ ان دیکھا، ان جانا۔ بس ایک ہی جست میں اسے دبوچ لے گا۔ وہ جا رہی ہے۔ جا رہی ہے۔ ایک سنسان سڑک پر اکیلی روتی جا رہی ہے۔ درندے کے لمبے لمبے دھاردار دانت خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا خون ہے جو اس راہ پر نیلوفر کی طرح تن تنہا گذرے ہیں۔

اس کی چینی کی گڑیا ٹوٹ گئی ہے۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ چپ چاپ اندھیرے میں تنہا رو رہی ہے۔ فضا میں گلے سڑے گوشت اور داغدار چمڑے کی بوجھل بو ہے۔ جیسے گرم تپتے ہوئے لوہے کو تازہ تازہ خون میں بجھا دیا ہو۔ کانچ کے ذرے اس کے ناخنوں سے اترتے ہوئے دل تک رینگ رہے ہیں۔ دماغ میں باریک باریک قینچیاں چل رہی ہیں، جیسے کوئی افشاں کتر رہا ہو۔ اور افشاں کا ہر ذرہ نشتر بن کر مانگ میں گھس رہا ہے۔ کوئی دم میں اس کی ہستی کرچی کرچی ہو جائے گی۔ درندہ

چلا آرہا ہے۔ اس کے پنجوں کے چٹخنے کی آواز دور بدلی میں چھپے بادلوں کی طرح کڑک رہی ہے۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ ٹوٹی ہوئی گڑیا ہتھیلیوں میں چبھنے لگی۔ آخری سیڑھی سے آگے نامعلوم خلا بگولے کی طرح اٹھے اور اسے دبوچنے لگے۔ اپنے جی کا زور لگا کر وہ چیخی، مگر فضا خاموش رہی۔

اس نے دیکھا کہ وہ ایک زریں قبر میں بند ہے۔ آبنوس کا کفن اسے اپنے شکنجے میں جکڑے آہستہ آہستہ سکڑ کر تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ زربفت، کمخواب اور شفون کے تھان اس کے پھیپھڑوں میں ٹھنستے چلے جا رہے ہیں۔ جگمگ کرتے جواہرات اس کے گوشت میں کنکھجورے کی طرح ہولے ہولے دھنس رہے ہیں۔ پکھراج پیپ کی طرح رس رہا ہے۔ یاقوت چھالے زخم کی طرح بہہ رہے ہیں۔ موتی سفید کیڑوں کی طرح اس کے جسم پر سرک رہے ہیں۔

سانس گئی۔ اب لوٹ کر نہیں آئے گی۔ یہ آخری سانس تھی

ایک زخمی سسکی کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ منھ کھلا رہ جانے کی وجہ سے اس کا تالو خشک ہو گیا تھا۔ زبان جوتے کے تلے کی طرح سن اور کھردری ہو رہی تھی۔ جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مریض کتیا کی طرح وہ کراہتی کانپتی اٹھ بیٹھی۔

جب پتلیاں ایک نکتے پر پڑیں تو اس نے دیکھا وہ ایک نہایت شاندار کمرے میں ڈبل بیڈ پر پڑی لرز رہی ہے۔ پہلو کا تکیہ خالی ہے، مگر کسی کے سر کا نشان دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ رات تنہا نہیں رہی۔ تھوڑی دیر تک تو اسے یاد نہ آیا کہ کس کے سر کے بوجھ سے تکیہ دھنسا ہوا ہے۔ وہ بالکل بھول گئی تھی کہ آج وہ کس کے ساتھ ہے

پھر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لباس سے اسے یاد آیا کہ وہ راجہ صاحب کے ساتھ رات کو موٹر میں روانہ ہوئی تھی۔ راستے میں دونوں بدمست ہو گئے تھے۔ نہ جانے کمرے تک وہ کیونکر پہنچی۔ راجہ صاحب ہی لائے یا انھوں نے کسی دوست کو اسے ادھار دے دیا۔ یا پونا کی طرح ڈرائیور کو بخش گئے۔ ایک دم اکیلے پن سے وہ ڈر کر کانپنے لگی۔ غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز پر وہ چونکی اور جلدی سے اٹھ کر بھاگی۔

پہلے تو وہ سمجھی کوئی پیلے رنگ کا بڑا مینڈک ٹب میں کود پڑا ہے، مگر فوراً ہی وہ راجہ صاحب کو پہچان گئی۔ اور ایک دم سے تنی ہوئی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ وہ وہیں اکڑوں بیٹھ کر ہنسنے لگی۔

"ارے تم جاگ اٹھیں۔"

وہ ہنسے گئی، جیسے کھوئی ہوئی کنجی مل جائے۔ یہ پہلی پہلی حسین دروازے کی کنجی!

"ارے کیوں ہنس رہی ہو؟" راجہ صاحب ہنسے

"اوہ!" وہ پیٹ پکڑ کر جھک گئی۔

"ذرا ہماری پیٹھ مل دو۔" پیٹھ ملتے وقت اس نے زندگی میں پہلی بار راجہ صاحب کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ اتنا پیے ہوتی تھی کہ غور ہی نہیں کیا کہ ان کے کندھے ڈھلکے ہوئے ہیں اور ٹانگیں بہت ٹھگنی ہیں۔ کپڑے پہن کر وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اتنے بھونڈے نہیں لگتے۔

مگر اتنے میں راجہ صاحب کو شرارت سوجھی اور اسے ٹب میں گرا لیا اور دونوں بچوں کی طرح چہلیں کرنے لگے کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہاتھ بڑھا کر راجہ صاحب

نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔

"گلاب کی قلمیں لگ گئیں۔" راجہ صاحب نے آہستہ سے ٹیلیفون رکھ دیا اور بڑے پیار سے نیلوفر کے سر پر صابن ملنے لگے۔ مزے مزے سے نہا کر دونوں نے کمرے ہی میں ناشتہ کیا۔

"تم تیار ہو جاؤ تو بازار چلیں۔"

"تھکن آ رہی ہے، شام کو چلیں گے۔"

"شام کو کہیں اور جانا ہے۔ اچھا کہو تو یہیں ساڑھیاں اور زیورات منگوا لیں۔"

"نہیں وہ پرانی سڑی چیزیں اٹھا لائیں گے۔ اچکن کے لیے کمخواب بھی دیکھنا ہے۔ کس دکان کا ذکر کر رہے تھے آپ؟"

"مگر نیلوفر نے دیکھا وہ کچھ سن نہیں رہے ہیں۔ بار بار سگریٹ سلگاتے ہیں اور پوری کی پوری ایک کش لے کر پھینک دیتے ہیں۔ وہ یونہی اخبار اٹھانے لگی۔ تاکہ دیکھے شاید کوئی نیا انگلش فلم چل رہا ہو، تو جلدی سے انھوں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے لیے۔

"بس جلدی تیار ہو جاؤ، گیارہ بج چکے ہیں۔"

نیلوفر نے ساریڈون کی ایک گولی حلق سے اتاری اور مرے دل سے تیار ہونے لگی۔ شاید خواب کی وجہ سے دل بجھا بجھا سا ہو رہا تھا۔

راجہ صاحب نے خزانے کا منھ کھول دیا اور اس نے جی بھر کے ساڑھیاں خریدیں ڈنر سیٹ، کٹلری اور چائے کا سیٹ براہ راست بمبئی بھجوانے کا آرڈر دیا۔

"ارے صاحب اندھیر ہو گیا۔" دکاندار ایک دم سے راجہ صاحب سے کہنے لگا۔
"کمخواب کے وہ دونوں تھان بھی رکھ دیجیے، جو پسند آئے گا وہ لے لیا جائیگا"
راجہ صاحب نے بات کاٹی۔

"کیسا اندھیر؟" نیلوفر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیگم صاحب۔ وہ... وہ ٹیکس اور بڑھا دیا بنارسی کپڑے پر"۔
دکاندار نے فوراً بات پلٹی۔

نیلوفر ایک آتشیں رنگ کی ساڑھی پر ایسی لٹو ہوئی کہ اس نے راجہ صاحب اور دکاندار کو قطعی فراموش کر دیا اور آئینے میں کندھے پر ساڑھی پھیلا کر دیکھنے لگی۔

"بھئی شام کو یہی پہن کے چلنا۔" راجہ صاحب مسکرائے۔

"اُنہہ! لعنت! ہم نہیں جائیں گے اس سوّر کے ہاں۔"

"ارے کیوں بے چارے کو مارتی ہو بے موت۔ صبح سے دو دفعہ ٹیلیفون کر چکا ہے"

"نفرت ہے اس کرنل کے بچے سے۔"

"جوہری کے ہاں جاتے وقت انھوں نے راستے میں سو کمبل، مٹھائیوں کے ٹوکرے، بسکٹوں کے پیکٹ اور پھل وغیرہ خریدے۔

"یہ سامان کیوں خرید رہے ہیں؟"

"اناتھ آشرم میں بانٹنا ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے وہیں سے پانچ چھ جگہ ٹیلیفون کیے۔

اچھا! جب ہی راجہ صاحب مصر تھے کہ سادہ ململ کی ساڑھی پہنو۔ خود بھی کھدّر کا چوڑیدار پاجامہ اور کرتا پہن رکھا تھا۔

یتیم خانوں میں اخباروں کے نمائندے اور فوٹو گرافر موجود تھے۔ بچے صاف کپڑوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح بھونچکے کھڑے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے بچوں کو مٹھائیاں دیتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تصویریں کھچوائیں۔ نیلوفر نے بڑے پوز مار کر کمبل اور سوئٹر دیے۔ اسے چاروں طرف سے اخبارچیوں اور فوٹو گرافروں نے نرغے میں لے کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی:

"بمبئی کے کس علاقے میں آپ سوشل ورک کرتی ہیں؟"

اس کا جی چاہا کہہ دے: "اے روڈ پر!" مگر راجہ صاحب آڑے آگئے:

"کوئی خاص علاقہ مخصوص نہیں۔ بس جنرل ورک کر لیتی ہیں۔"

"آپ وہاں پیشہ ور عورتوں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟"

نیلوفر کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے۔

"وہیں تو کام کرتی ہوں"۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"جی ہاں پون پل اور فارس روڈ۔" راجہ صاحب نے اس کے بازو میں کہنی مار کر جلدی سے لگام اپنے ہاتھوں میں تھام لی۔

"کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو گئے لیکن پھر بھی اس بے شرمی کے پیشے کا انسداد نہیں ہوا۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے اخبار کا پڑھا ہوا جملہ دہرایا۔

اناتھ آشرم کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں نے ہار پھول پہنائے اور مہتمم صاحب نے راجہ صاحب کی شان میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھا۔ ان کی فیاضی، دریا دلی اور کسر نفسی پر روشنی ڈالی۔ پھر ان کے وہ تمام احسانات گنائے جن کے بوجھ سے انسانیت کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ نیلوفر سے انھوں نے کہا:

"ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ آپ جیسی دیوی کے درشن پراپت ہوئے۔ ہماری قوم اور ملک کا آپ ہی جیسی مہان دیویاں کلیان کر سکتی ہیں۔"

نیلوفر کے حلق میں قہقہہ گدگدانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہہ دے:

"اُلّو کے پٹھے کیا تیری ماں بہن بھی ملک کی اسی طرح سیوا کرتی ہیں؟"

واپسی پر راجہ صاحب بہت مگن تھے۔

"بھئی واہ جیو، تم نے تو زور باندھ دیا۔ یہ سب اس سفید ساڑھی کا چمتکار تھا۔ بالکل دیوداسی لگ رہی تھی۔ ارے تم مجھ سے لڑو جھگڑو نہیں تو سچ کہتا ہوں چناؤ میں کھڑا کر دوں۔"

"اے ہے بھی۔ مجھے تو وحشت ہو رہی تھی۔"

"ارے سب وحشت ختم ہو جائے گی ہولے ہولے۔"

"آج کرنل کی دعوت گول کر جائیں؟" اس نے راجہ صاحب کا موڈ دیکھ کر کہا۔

"نہیں جی خواہ مخواہ اکڑ جائے گا۔ بڑا بد ہے منحوس۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے خون خرابہ نہیں ہوگا۔" نیلوفر نے قریب قریب چیخ کر کہا اور اخبار کو دونوں ہاتھوں سے کھسوٹنے لگی۔

"میرا تو سارا ایمان لوٹ پوٹ ہو گیا۔"

"جھوٹ!" وہ اخبار میز پر بچھا کر، اس پر دونوں مٹھیاں مار کر چیخی: "یہ دیکھیے!"

"اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ اٹھو تیار ہو جاؤ۔ وہی گلابی ساڑھی پہننا، تم پر خوب کھلتی ہے۔"

"خاک پڑے کپڑ دل پر۔"

"تو کیا مطلب تمہارا؟ کیا غنڈے میرے کارخانے کو آگ دیتے تب ہی تمہیں خوشی ہوتی؟"

"کون سے غنڈے؟"

"وہی جو میرے دشمن ہیں جن کی وجہ سے میرا کارخانہ بیٹھا جا رہا ہے۔"

"وہ موئے دو کوڑی کے مستری، بھلا ان کی اتنی بساط تھی کہ آپ کا کچھ بگاڑ لیتے؟"

"کیا عقل مند ہو جی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ میرے کارخانے کے لیے کون کا سندیسہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے پرزے سستے بھی ہوتے تھے اور بہتر بھی ہوتے تھے۔ وہی لوگ تو آگ لگانے پر تلے ہوئے تھے۔ کیا مرضی ہے تمہاری، منشی انھیں کارخانہ بھسم کر لینے دیتا؟"

"تو پھر یہ کالج کے لڑکے کیوں لپیٹ میں آگئے؟"

"اونہہ، یہ لڑکے تو بد معاش ہوتے ہی ہیں۔ سنتے ہیں کہ کالج کے کسی لڑکے کو چار پانچ اسٹوڈنٹس نے پیٹ دیا۔ دوسرے فرقے کے دو یار تیلیوں کو جو خبر ملی تو وہ بھی بھنّا اٹھے۔ آخر وہ اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھ کر کیسے خاموش رہتے؟ بس اتنی سی بات کو لے کر اچھال رہے ہیں یہ اخبار والے۔"

"اور پولیس؟"

"بس ذرا دیر سے پہنچی۔ اتنی دیر میں لوگ آگ لگا چکے تھے۔ معاملہ قابو سے باہر ہو گیا۔ یہ سب ان کالج کے لونڈوں کی بد ذاتی کا نتیجہ ہے۔ معاف

کرنا یہ لوگ تو بات بات پر غنڈہ گردی پر تل جاتے ہیں۔ ان کی ذہنیت ہی دنگے فساد کی ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ بازار میں لوگ کہہ رہے تھے کہ باہر سے غنڈے بلا کر عمداً بلوہ کرایا گیا ہے۔ پہلے سے ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ پیاقوڈل اور ایسڈ کے بموں سے حملہ کیا گیا۔"

"کیا بکو اس بازار میں سے سن آئیں اور میرا بھیجا چاٹ رہی ہو۔"

"مگر وہ جو رات کو لاریوں میں سے اتر رہے تھے، مجھے تو غنڈے لگ رہے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے دس پندرہ غنڈوں نے یہ طوفان جوت دیا"

"پچاس سے کم نہیں تھے۔ بعد میں اور لاریاں بھی آئیں۔"

"چلو وہ پچاس ہی ہوں گے، مگر وہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ پانچ ہزار کا مجمع دھاوا بولنے آیا تھا۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ یہ لوگ رائی کا پربت بنا رہے ہیں۔"

"آگ لگانے کو چنگاری بھی کافی ہوتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ بلوے میں کرایا کرتا ہوں؟"

"آپ نہیں تو آپ ہی جیسے کوئی دوسرے ہوں گے۔ ورنہ یہ بتایئے کہ اگر یہ کالج کے لڑکوں کی لڑائی تھی تو زیادہ تر وہ غریب مستری کیوں تباہ ہوئے جو آپ کے کارخانے کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے؟ انھیں کی جھونپڑیاں اور دکانیں جلیں جو آپ سے ہٹ کر رہے تھے۔"

چند سیکنڈ کے لیے ہوٹل کے کمرے میں موت کا سا سنّاٹا چھایا رہا۔ نیلوفر کو ایسا لگا جیسے صدیاں خاموشی سے بیت گئیں ۔ اور پھر طوفان ٹوٹ پڑا:

"دو ٹکے کی رنڈی اور ہمارے* منھ آئے! کوئی نیا یار ڈھونڈ لیا ہے کیا؟ میں جتنی طرح* دے رہا ہوں اتنا ہی* سر پہ چڑھی جا رہی ہے۔ کتنی بار کہا کہ یہ باتیں تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ یہ قادر بھائی سے معاملہ چل رہا ہے۔ اُسی نے کان بھرے ہوں گے تمہارے۔ غدّار زمانے بھر کا۔ پول کھول دوں تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ سالے نے بلیک مارکیٹ کا روپیہ کھلا کھلا کر حمایتی جمع کر لیے ہیں۔ انھیں کے بل بوتے پر اکڑتا ہے۔ تم مجھے فرقہ پرست کہہ رہی ہو؟ تمہیں میں نے کنگالپن سے ایک دم رانی بنا کر بٹھا دیا۔ میرے دوستوں میں ہر فرقے کے لوگ ہیں۔"

نیلوفر کے بھیجے میں طوفان اُبلنے لگے۔ وہ بھی غصّے* کی پوری تھی۔

"میں نے آپ کو فرقہ پرست نہیں کہا۔" وہ بڑے ضبط سے بولی۔

"پھر کیا کہا؟"

"میں نے تو... میں نے کچھ نہیں کہا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم نے مجھے خونی کہا۔ یا گھنڈی کہا۔ اور کیا کہنا چاہتی ہو؟ جاؤ اور پھرے بازار میں کہتی پھرو، دیکھیں گے ہم بھی کہ کون سنتا ہے تمہاری؟ اپنے کو سمجھا کیا ہے تم نے؟ قسم سے میں بھی اپنی سی* پر آجاؤں تو بمبئی میں جینا دوبھر ہو جائے گا۔ فارس روڈ پر سڑ کے مروگی۔ کوئی شریف آدمی جنم

میں تھوکے گا بھی نہیں۔ یہ سالا فلیٹ سلیٹ چار دن میں نیلام کرا کے فٹ پاتھ پر ڈلوا دوں گا۔"

نیلو فر سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

راجہ صاحب موم کے نہ سہی، نمک کے بنے ہوئے ضرور تھے، جلد ہی بہنے لگے۔

"اچھی میری دوست بنتی ہو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو کہ کارخانے میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ ایک ایک بوند کے لیے گھٹنے ٹیک دینے پڑتے ہیں۔ اگر ڈھیل دیتا چلا جاؤں تو دو دن میں دیوالہ پٹ جائے۔ ایک سے ایک بڑھکے مگر مچھ منھ پھاڑے ہوئے ہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ کہاں تک تمہارے دماغ میں کوئی ٹھونسے۔ ہم لوگوں کی مشکلوں کا کوئی ٹھکانا ہے؟ اُدھر بزنس میں بنیا تنبو پھیلائے پڑا ہے۔ جاگیریں چھن گئیں۔ گورنمنٹ کوئی حفاظتی قدم نہیں اٹھاتی۔ اپنا بچاؤ خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ چلو مان لیا کہ میں نے اپنے کاروبار کی حفاظت کے لیے ذرا سختی سے کام لیا، تو اس کا یہ کیسے مطلب ہوا کہ بلوہ میں نے کردایا۔ یہ اتنے شہروں میں جو خون خرابہ ہو رہا ہے، کیا وہ بھی میں نے کردایا ہے؟ مجھے کیا نفع ہوا ان جھگڑوں سے؟ وہاں تو میرا کوئی کاروبار بھی نہیں۔ یہ لوگ تو دیوانے کتوں کی طرح لڑا ہی کرتے ہیں۔ نیچی قوم کے لوگ ہی مرتے، کٹتے ہیں، شریف تو ہر طرح مل جل کر ہی رہتے ہیں۔"

نیلو فر چپ چاپ یہ بھاشن سُن کر پلنگ پر اوندھے منھ پڑ گئی۔

"اب یہ رو رو کر آنکھیں سجانے سے فائدہ؟" انھوں نے اس کا شانہ ہلایا۔

"بھاڑ میں جائیں یہ سب۔" نیلوفر نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ "بقول کسے دو پیسے کی ٹکھیائی ہوں، کوئی قوم کی لیڈر تو نہیں۔ نہ جانے کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ کون مارتا ہے اور کون مرتا ہے۔ سب کچھ خدا کی مرضی ہی سے ہوتا ہے وہ سب سے بڑا منصف ہے۔ وہ ہر مجرم کو خود ہی سزا دے گا۔ جسے چاہے گا عزت دے گا، جسے چاہے گا ذلت دے گا۔ یہ چندن ہار، بنارسی جوڑے، زبیدہ کے دولھا کا جوڑا۔ اگر زبیدہ کی شادی میں خدا نہ کرے کوئی کھنڈت پڑ گئی تو کیا یہ مردے جی اٹھیں گے؟ ان کی جلی ہوئی دکانیں اور جھونپڑیاں پھر سے بن جائیں گی؟ جب معصومہ نیلوفر بنی تو دنیا والے کہاں تھے؟ کس نے سر پہ ہاتھ دھرا؟ یہاں تو بس اپنی ڈفلی اپنا راگ! اپنی بلا سے کوئی جیے یا مرے۔"

"اے جی میں کہتا ہوں اب اٹھو گی یا پڑی سوگ مناتی رہو گی۔" راجہ صاحب ادھر سے پھر کر لیٹ گئے۔

"جائیے ہم سے بات نہ کیجیے۔" دم بھر کے لیے گمراہ ہونے والی رنڈی جاگ اٹھی۔

"اچھا ذرا ہماری طرف منھ کرو۔"

"رہنے دیجیے۔ ذرا بھی کوئی بات کروں تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں میرے دل میں کوئی شبہ ہو تو آپ سے نہ کہوں تو کیا چوراہے پر پوچھتی پھروں؟ اس مردود قادر بھائی سے جا کر پوچھوں؟ کیسی جلی کٹی سناتا ہے جب ملتا ہے تو"

"کیا جلی کٹی سناتا ہے؟"

"کہ شریف خاندان کی لڑکی ایسے لوگوں کے چکّر میں کیوں پھنسی ؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا ؟"

"میں نے کہہ دیا یہ لوگ میرے فیملی فرینڈ ہیں۔ میں تو اپنی بہن کا جہیز خریدنے آئی ہوں۔ زبیدہ کے سسرال والوں کا نام سن کر اتنا سا منھ نکل آیا۔"

"پھر ؟"

"پھر فساد کے بارے میں کہنے لگے کہ سب پہلے سے تیاریاں ہو چکی تھیں۔"

"اور تم نے یقین کر کے میرا بھیجا چاٹنا شروع کر دیا۔ ——— اچھا اس نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں نے میرے کارخانے میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔"

"قادر بھائی کہہ رہے تھے کہ یوں ہی جھوٹ موٹ باہر سے لوگوں کو بلا کر چوکیدار کی کوٹھری میں خود ہی آگ لگوا دی۔"

"اور پھاٹک جو توڑ ڈالا، وہ بھی میں نے خود تڑوایا ؟ تمام کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور کر دیے۔ اس حرام زادے کی باتیں سنکر تم نے یقین کر لیا۔"

"کمبختوں نے بے چارے چوکیدار کی کوٹھری کیوں جلا دی ؟"

"وہ دوسری بن جائے گی۔ میں نے منشی سے کہہ دیا ہے کہ اسے اپنی کوٹھی کے شاگرد پیشے میں جگہ دے دیں اور پکی کوٹھری جلدی سے جلدی بنوا دیں۔ مجھ سے تو جو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان غریبوں کے لیے کرتا ہی رہتا ہوں۔ اچھا اب اٹھو بھی۔ تیار ہو جاؤ، پھر کیا تھا فون اس نے۔"

"اوں ـــ ہمارا جی نہیں چاہتا۔"

"برا مان جائے گا بھئی۔"

"ماننے دو مردے کو۔ آپ کا کام تو پورا ہو گیا اب۔"

"ارے نہیں بھئی۔ اصل کام تو اب پڑے گا سالے سے۔ تم کیا سمجھتی ہو ایک سے ایک حرامی بھرا پڑا ہے۔ ابھی تو جھگڑے اٹھائے جائیں گے، انکوائری ہو گی رپورٹیں تیار ہوں گی۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ کرنل بڑا بارسوخ آدمی ہے۔ بڑا لچا ہے۔ اس سے۔ اس سے معاملہ طے ہوا تھا۔ —— اب اگر میں اپنی بات سے پھر کر غچہ دے جاؤں تو میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ قادر بھائی کی پارٹی سے مل کر بہت ہلکان کرے گا۔ کمیٹی پر اس کا نام ضرور ہو گا۔ کسی نہ کسی طرح میرا یار ہر جگہ گھس ہی جاتا ہے اس لیے سہنا پڑتے ہیں اس کے نخرے۔"

"مر جائے کمبخت!"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ مگر یہ جھگڑا ختم ہو جائے ایک دفعہ، پھر میں بھی سالے کو وہ مزہ چکھاؤں گا کہ یاد ہی کرے گا۔ ویسے بھئی تم پر تو بری طرح لٹو ہو گیا ہے بیچارہ۔ میرے پیچھے پڑا ہے کئی دن سے۔ کہتا ہے کہ مڈل ایسٹ تمہیں ساتھ نہ لے جاؤں۔"

"کیوں؟"

"وہ یہاں تمہاری جدائی میں سورگ باش ہو جائے گا۔"

"ہو جائے کتا، میری جوتی سے۔"

"اچھا تو تم ذرا بال بنوا آؤ۔ وہی موسل کی وضع کا جوڑا بنوانا، اس پر وہ لمبے بندے، جو آج خریدے ہیں، ٹھیک رہیں گے۔"

"وہ تو زبیدہ کے ہیں۔"

"زبیدہ کے لیے کوئی دوسرے لے لیں گے۔"

جب نیلوفر آتشیں ساڑھی پہن کر، موسل کی وضع کا جوڑا باندھے، لمبے لمبے آویزے جھلاتی بن ٹھن کر تیار ہوئی تو راجہ صاحب نے پیچھے سے جاکر اس سے بھڑتے ہوئے کہا: "آنکھیں میچو۔"

"کیوں؟" وہ ٹھنک کر بولی۔

"میچو آنکھیں۔"

نیلوفر نے آنکھیں میچ لیں۔ کھولیں تو جڑاؤ چندن ہار کرنوں کے جال کی طرح اس کے روپہلے سینے پر تھرک رہا تھا۔ ایک دم اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے ننگے جسم پر پگھلا ہوا سونا انڈیل دیا۔ اس کا تالو خشک ہو گیا اور بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ ہار کو نوچنے کے لیے اٹھ گئے۔ مگر ہار میں جیسے کوئی مقناطیسی طاقت چھپی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ وہیں چپک کر رہ گئے۔ راجہ صاحب نے شانے پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑا اور وہ ان کے ہاتھوں میں کمان کی طرح کھنچ گئی۔

•

کرنل صاحب کی پارٹی بڑی چینی جاگتی اور ہنگامہ خیز تھی۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ زیادہ تر لوگ پچاس سے پچپن کے سن کے ہوں گے۔ عورتیں

کم سن اور چلبلی تھیں۔ کسی کی کم از کم پہلی بیوی تو وہاں موجود نہیں ہوگی۔ سب نیلوفر کی عمر کی یا اس سے چھوٹی ہی تھیں۔ خواتین کی تعداد چونکہ کم تھی، لہٰذا ئل بانٹ کے لوگ ہنس بول رہے تھے۔ نیلوفر اور راجہ صاحب ذرا دیر سے پہنچے۔ ہوٹل سے ایک ایک پیگ لگا لیا تھا، مگر وہ لوگ تو پانچ بجے سے ڈٹے ہوئے تھے۔

"آخاہ، آداب عرض ہے۔" اسے راجہ صاحب سے الگ دیکھتے ہی قادر بھائی نے دبوچا۔ وہ ٹال کر چلنے لگی تو قادر بھائی ہنسا۔

"تو ہمارا اندازہ ٹھیک تھا۔"

"کیا مطلب ہے؟" وہ رک گئی۔

"ڈانٹ پڑی ہے؟"

"کیسی ڈانٹ ہے؟"

"ہم سے نہ اڑیے — ہم اڑتی چڑیا کے پر گن لیا کرتے ہیں۔"

"بھئی ہم سے پہیلیاں نہ بجھوایئے۔" اسے ہر مرد سے تنکا کر بولنے کی عادت پڑ چکی تھی۔

"ہم سے بات کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اب دیکھیے مکرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"مکرنے کی کیا ضرورت ہے صاحب۔ کوئی تو بات ہوگی جو منع کیا۔"

"بات یہ ہے کہ راجہ صاحب کی اس ناچیز نے پھونک سرکنی ہے۔"

"اچھا؟" نیلوفر جل گئی۔

"جی ہاں، اسلیے کہ ہم اس کا سارا کچا چٹھا جانتے ہیں۔ بڑا بدنصیب ہے بیچارہ۔"

"وہ کیسے؟"

"کوئی لونڈیا ٹکتی ہی نہیں بے چارے کے پاس۔ یار لوگ لے اڑتے ہیں۔ گھنّا نُوا مال ہے نا، جبھی تو نخرے برداشت کر لیتا ہے۔"

"آپ کو راجہ صاحب سے خداواسطے کا بیر ہے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ ہمارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے؟ اس سے زیادہ ہمارا انفلوئینس ہے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس پیسہ ہے۔ وہ دو کوڑی کا زمیندار راجہ بن بیٹھا ہے، ہم دو سو برس سے بزنس میں ہیں۔ تو اگر جلتا ہے تو وہ ہم سے جلتا ہے اور ڈرتا بھی ہے۔ اب یہ جو اس نے گڑبڑ کی ہے تو ہم سے دبنا پڑیگا اسے۔"

"کیوں؟"

"ہمارا پریس میں بڑا انفلوئینس ہے۔ ہم سالے کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔"

"تو آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟ انھیں سے کہیے نا۔"

"ہم تم سے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تم انھیں سے کہو کہ دہلی میں جو اس کا سینما ہے وہ ہمارے ہاتھ بیچ دے۔"

"کیا کریں گے آپ اس سینما کا؟ ایسی کیا مار پڑی ہے؟"

"بس ہے ہمیں ضرورت۔"

نیلوفر نے جب راجہ صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے بڑی موٹی موٹی گالیاں دیں۔

"اے ہے آخر کیا سرخاب کے پر لگے ہیں اس سینما میں؟" نیلوفر چڑ گئی۔

"بات یہ ہے کہ وہ حصہ ٹاؤن پلاننگ کے حلقے میں آنیوالا ہے۔ آدمی کا رسوخ ہو تو سرکار سے بہت اچھے دام ملیں گے۔ مجھ سے اونے پونے خرید کر وہ اس کی ڈبل قیمت وصول کر لے گا۔"

"مگر اس کا اتنا اثر کیوں ہے؟"

"بس اس نے رگ داب لی ہے۔ اپنے فرقے کا لیڈر ہے، غل مچانے لگتا ہے اسے خاموش کرنے کے لیے منہ بھرنا پڑتا ہے۔"

"یعنی اگر اس کا منافع ہو جائے تو اس کے فرقے کے لوگوں کی شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔"

"کم از کم یہ ان کا ذکر تو جلسوں میں نہیں کرتا۔ اخباروں میں چکنے چپڑے بیانات دے دیتا ہے۔ ویسے بالکل چمگادڑ سمان ہے، کبھی اس پارٹی میں تو کبھی اس پارٹی میں۔ دوسرے تم نہیں جانتیں، اپنے سب سے بڑے دشمن ہم خود ہیں۔ یہاں ایک کی چوٹی دوسرے کے جوتے تلے دبی ہوئی ہے۔ ہاں تو تم اس سور کے بچے سے کہہ دینا کہ سینما مل جائے گا۔ میرے کارندے سے جا کر مل لے۔"

"مت دیجیے نا"

"نہیں جی۔ اس وقت اگر اس نے الٹی سیدھی کمیٹیاں میرے پیچھے لگا دیں، تحقیقاتیں شروع کر دیں تو بے کار کی دردسری ہو گی۔"

"جب آپ نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر آپ کی جوتی ڈرتی ہے تحقیقات کمیٹیوں سے"

"عورت کا بھیجا بچی میں پاؤ رتی کا ہوتا ہے۔ اری پگلی یہ دنیا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا، اس سے پہلے کے جانور زمین پر گرے، گدھ منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔"

اور ادھر لڑکھڑایا کہ بس ٹوٹ پڑے ۔ نہ جانے کتنے لوگ جلے بیٹھے ہیں۔ بہانہ مل جائے تو کچا چبا جائیں ۔ اس کے علاوہ قادر بھائی سات پشت کا بنیا سہی، مگر سر پیکر ٹکے نہ دے تو نام پلٹ دینا ۔ “ راجہ صاحب نے قہقہہ لگایا۔

” کیا مطلب ؟ میں سمجھی نہیں ۔ “

” نہ سمجھو رانی ، یہی اچھا ہے ۔ قسم سے آج تو اپسرا لگ رہی ہو ۔ “

” ہٹیے ۔ سر پیکر کر رونے کی کیا بات ہے ؟ “

” کچھ لوگ اوپر ہی اوپر پلان بنا رہے ہیں ۔ اگر ایسا ہوا تو سارا ٹاؤن پلاننگ کا نقشہ ہی بدل جائے گا اور تب سالے کو پتہ چلے گا تو بلبلا کر رہ جائے گا ۔ “

” اے ہے ، تب تو بڑا مزہ آئے گا ۔ “

” ہاں بڑا اسٹینا ہیگا ۔ ادھر بڑے زوروں سے جھگڑا اچل رہا ہے ۔ اسکے پرکھوں کو بھی خبر نہیں کہ معاملہ ابھی زیر غور ہے ۔ یعنی کھٹائی میں پڑا ہے ۔ میں چاہ رہا ہوں کہ میری کھاری کوئیاں والی زمین حلقہ میں آجائے ۔ بڑی ناکارہ چیز ہے ۔ مگر اچھے دام مل جائیں گے ۔ “

” کیسا جھگڑا اچل رہا ہے ؟ “

” ارے بھئی سب ہی اپنی اپنی زمینوں کو بھڑانے کی فکر میں ہیں ۔ وہ تو جسکی آواز اونچی ہو گی ۔ اسی کا کام بن جائے گا ۔ سب ہی زور لگا رہے ہیں ۔ “

پارٹی شباب پر تھی ۔ ہر فرقے اور مذہب کے نمائندے موجود تھے ۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں ، ہاتھوں میں گلاس تھامے ، ایک دوسرے کی بدگوئیوں میں مصروف تھے ۔ بیوپار ، سیاست اور فلسفۂ زندگی کے موضوع

سے لے کر مصنوعی اور غیر مصنوعی جسمانی ساخت تک۔ ہر رنگین اور مہذب میلے ٹاپک پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا۔ کرنل صاحب کا چہرہ فرطِ مسرت سے یا شراب کی گرمی سے چقندر ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل نیلوفر کے گرد منڈلا رہے تھے۔ بار بار اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاتے اور گرم گرم بھاپیں اس کی گردن پر چھوڑنے لگتے۔ ان کی توند ان سے پہلے نیلوفر سے لپٹ جاتی۔ اور وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

قادر بھائی مس بھارتی سنہا کے پہلو سے ایسے چپکے ہو رہے تھے جیسے دونوں کے جسم میں ایک ہی ڈھانچہ پڑا ہوا ہو۔ مسٹر انجینئر مسز مارٹن سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ مہمان مختلف ترین جنسوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ کس قدر شاندار یکجہتی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مختلف صوبوں اور فرقوں کے لوگ، آپس میں یوں ایک دوسرے پر قربان ہو رہے تھے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کہیں انھیں دو فرقوں کے انسان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ اور چھوپٹریاں جلا رہے تھے۔ اگر خوش اسلوبی اور ہوشیاری سے طبقاتی کشمکش کے دھارے کو موڑ کر اسے فرقہ واریت کا رنگ دیدیا جائے تو ان مرنے مارنے والوں سے کسی کو ہمدردی نہیں رہتی۔ ان مستریوں میں، جو راجہ صاحب کے کارخانے کے لیے خطرہ بن گئے تھے، دونوں فرقوں کے لوگ تھے۔ اپنے اصلی دشمن کی طرف انکا دھیان بھی نہ گیا۔ وہ بڑی مستعدی سے ان کے منصوبے کو کامیاب بنا رہے تھے۔

رات گہری ہو گئی۔ بوفے ڈنر کا انتظام تھا۔ بیسیوں قسم کے کھانے چنے

ہوئے تھے۔ کھانے والے کھا رہے تھے، مگر زیادہ تر مرد اور چند خواتین
ابھی تک پینے پر جٹے ہوئے تھے۔ نیلو فر بڑی ترنگ میں آئی ہوئی تھی۔
کرنل صاحب اس کی پلیٹ میں مرغ کی آٹھویں ٹانگ لاد رہے تھے۔ ایک طرف
ایک صاحب خاموش سب سے الگ تھلگ کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ اگر ذرا سی ٹھیس لگ گئی تو ساری چھلک جائے گی۔ ایک نہایت
ہر دلعزیز شاعر صاحب نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے نہایت بے تکلفی سے اپنا پاجامہ
تر کر لیا تھا۔ ان کے اشعار پر سر دھننے والی خواتین ان سے دور کھڑی نفرت
سے ناکیں سکیڑ رہی تھیں۔ مرد نہایت خوش تھے۔ شاعر صاحب مرد جاتی
کے روحانی رقیب رُو سیاہ تھے اور ان کی اس درگت سے ذرا ان کی قیمت
گر جانے کی امید ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے دو نوکروں نے انھیں بہلا پھسلا
کر اٹھایا تاکہ رکشا میں بھر کر مال واپس کر آئیں۔ مگر وہ بہت بگڑ رہے تھے
کہ ابھی تو ان کی باری نہیں آئی، حسین ترین اشعار تو ابھی سنائے ہی نہیں
مگر لوگ ان کی اس قدر فی البدیہہ شاعرانہ حرکت سے کافی سیر ہو چکے تھے
اس لیے ان کی سنوائی نہ ہوئی۔ بیرے انھیں زبردستی کھینچتے ہوئے گئے
نیلو فر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے کے ارمان میں موصوف بلبلاتے ہی
چلے گئے۔

ایک صاحب نہ جانے کس بات کی بار بار معذرت چاہے جا رہے تھے۔
ہزار بار "کوئی بات نہیں۔" کہنے کے بعد بھی وہ معافی مانگنے پر جٹے ہوئے تھے۔
ایک محترمہ بار بار اپنا پرس اور رومال نہ جانے کہاں رکھ کر بھولی جا رہی تھیں۔

لوگ بڑی خندہ پیشانی اور فخر سے بار بار سرک کر انھیں ٹٹولہ تلاش کرنے میں مدد دے رہے تھے۔ ان کے تازہ ترین ایڈمائرر ایسے پریشان تھے گویا رومال نہیں کوہ نور ہیرا کھو گیا ہے۔ انھیں ان لوگوں پر طیش آ رہا تھا جو رومال کی گمشدگی میں قطعی ہیبت زدہ نہیں تھے۔ سب کو اٹھ کر ننگا جھاڑا دینا پڑتا تب ان کا رومال ان کے بلاؤز یا آستین سے نکلتا۔ تب بڑی شدّ و مد سے لوگ ان کی مدد کرتے اور وہ گدگدی سے بے تاب ہو کر صوفے پر لوٹ جاتیں۔ کسی کا ان کی اس حرکت پر قطعی جی نہیں جل رہا تھا۔

نیلوفر خالی پیٹ مستقل پینے میں مشغول تھی۔ بوفے کی میز کی طرف دیکھتے ہی اسے ابکائی آنے لگتی۔ نشے میں جب ایک بات کی دھن ہو جائے، تو پھر نہیں اترتی۔ نہ جانے کیوں نیلوفر کو شبہ ہو گیا تھا کہ گوشت ضرور کتّے کا ہے۔ سنا تھا کانپور میں ایک گروہ پکڑا گیا تھا جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے کباب بنا کر بیچا کرتا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں چندھی کر کے گوشت کی چیزوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک دفعہ تو اس نے ایک ننھی سی انگلی بھی شوربے میں تیرتی دیکھی۔ لاکھ سب نے سمجھایا کہ دم کی ہڈی ہے مگر وہ کسی طرح نہ مانی۔ اور جب ہنستے ہوئے راجہ صاحب نے ہڈی منہ میں ڈال کر کڑکڑ چبا ڈالی تو وہ ابکائی روکتی پلیٹ پھینک کر بھاگی۔ ترکاری تک میں اسے انسانی آنکھیں اور دانت نظر آ رہے تھے۔ راجہ صاحب اسے بار بار روک رہے تھے کہ زیادہ پینا مناسب نہیں، مگر کرنل صاحب کی پالیسی کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ پلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ایک دم نیلوفر کو محسوس ہوا کہ وہ بالکل اکیلی دور کہیں ایک بنجر چٹان پر کھڑی ہے چاروں طرف سناٹا گرج رہا ہے۔ موت کی سی خاموشی زور رہی ہے۔ اگر پیدا ہونے سے

پہلے کسی نے اس سے پوچھ لیا ہوتا تو وہ جان بوجھ کر تو دنیا میں نہ آتی ۔ بے اختیار اسے زندگی کی بے بسی پر رونا آنے لگا ۔ اور وہ راجہ صاحب سے لپٹ کر پھوٹ پڑی وہ اسے بالکل اباجی معلوم ہو رہے تھے اور وہ خود نیلوفر نہیں جیسے ان کی نوجوان بیوی تھی، جس کی خاطر انھوں نے گھر بار، بال بچے تج دیے تھے ۔ کاش کوئی اس سے بھی ایسی بینائی سے پیار کرے ۔ اس کے لیے اپنا خاندان چھوڑ دے ۔ کسی مضبوط بانہوں والے رکھوالے کی آغوش میں چھپ جائے، پھر یہ انجانے خوف اسے نہیں ستائیں گے آخر کسی کو اس کی پاک دامنی اور نسوانیت کی فکر کیوں نہیں ؟ کیا وہ عورت نہیں ؟ اس کا دل بھی تو لاکھوں پیاری پیاری باتوں کے لیے دھڑکتا ہے ۔ کاش وہ بھی کسی کو اتنی عزیز ہو جائے کہ وہ کرنل صاحب کو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر بھائیں چھوڑنے سے روکے ۔ اس نے راجہ صاحب کے گریبان میں جھول کر آنسو بہانے شروع کر دیے ۔ پروگرام کے مطابق آج وہ کرنل صاحب کی مہمان تھی، اس لیے وہ اسے سنبھالنے* لپکے، مگر وہ ضدی بچے کی طرح راجہ صاحب سے چمٹ گئی ۔ راجہ صاحب اور کرنل صاحب میں بحث ہونے لگی ۔ نہ جانے کون جیتا، کون ہارا، کس نے اسے سنبھالا ۔

"اباجانی ۔ اباجانی ۔ مجھے لے لو ۔ اباجانی ۔" وہ سسکیاں لیتی نیند جیسی مدہوشی میں ڈوب گئی ۔

اس رات اس نے پھر وہی نامراد خواب دیکھا ۔ وہ اکیلی چلی جا رہی ہے ۔ اسی جانی پہچانی انجان سڑک پر ۔ وہ سڑک جو اژدہے کی طرح ہانپ رہی ہے ۔ جس کے خاتمے پر مہیب دہانہ ہے ! اس کے گلے میں سسکیاں منجمد ہو چکی ہیں اور آنسو خشک ہیں ۔

ہمیشہ کی طرح چیخ مار کر وہ بھاگ پڑی۔ کمرے کی گھٹی ہوئی روشنی میں راجہ صاحب کا تحفہ، چندن ہار، اس کے سینے پر جگمگا رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا کر دیکھا۔ چندن ہار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ موتی جگر جگر مسکرانے لگے۔ لال لال خون میں لتھڑے ہوئے مستریوں کے سر اور ننھے ننھے بچوں کی کھوپڑیاں اس کے ننگے سینے پر قہقہے مار کر ہنسنے لگیں۔ وہ چیخ مار کر پلنگ سے نیچے گر پڑی اور چندن ہار کو دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ کرنل صاحب نے اسے بہت چمکارا، کلیجے سے لگایا، مگر اسے جیسے جاڑا بخار چڑھ رہا تھا۔ اس کو گھن آ رہی تھی، مگر ڈر کے مارے گھگی بندھی ہوئی تھی۔ اس وقت کرنل صاحب کا وجود ہی غنیمت تھا۔ وہ صبح تک آہ و زاری کرتی رہی، کراہتی رہی۔

دلہن کی جیٹھانیاں اور نندیں چیزوں کی بڑی مستعدی سے فہرست بنا رہی تھیں خاص طور پر چندن ہار کی تعریفوں میں تو بیویوں کی زبانیں سوکھی جا رہی تھیں۔ مگر نیلوفر ڈر کے مارے اب تک چندن ہار کی طرف نہیں دیکھ پا رہی تھی کہ کہیں کمبخت ٹھٹھا مار کر ہنس نہ پڑے۔ کیا غریب بھاگ بھاگ کر مہمانوں کی خاطر مدارات کر رہی تھی۔

رخصت کے وقت وہ بہن کو کلیجے سے لگا کر اس بری طرح بلک کر روئی کہ دشمنوں کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے پاس کھڑی ایک بیوی نے کان میں پھسپھسایا:

"زبیدہ نیلوفر کی ناجائز بچی ہے۔"

جی چاہا پوچھ لوں: "اور آپ؟"

شادی کے ہنگامے میں نیلوفر نے نشے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ جب سچے موتی جیسی پاک اور آبدار بہن بیاہ کر چلی گئی تو اس نے مہمانوں کے رخصت ہونے کا بھی انتظار

نہ کیا اپنے کمرے میں بند ہو کر اتنی شراب پی کر دوسرے دن شام تک بے سدھ پڑی رہی۔ کبھی کبھی کمرے میں سے آہوں اور سسکیوں کی آواز آتی اور پھر قبر کی سی مردنی چھا جاتی۔

"اچھی ہوں امی جان۔" وہ بیگم کے پے درپے کھٹکھٹانے پر کہتی۔ انھیں بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ لوگ آ کر لوٹے جا رہے تھے اور نواب زادی کی میت کمرے میں بند پڑی تھی!

بیگم نے تیسرے دن گھبرا کر صفِ ماتم بچھا دی۔ دروازہ کھلوا کر چھوڑا۔ ہاتھ پیر جوڑ کر اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے پر راضی کیا۔ ایک ہفتہ تک نیلوفر غائب رہی۔

لوگوں نے کہا: "حمل گرانے ہسپتال گئی ہے۔"

کچھ دنوں کے لیے نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گئی۔ پھر جو آئی تو دونوں دونوں ہاتھوں سے زندگی کو لٹانے لگی۔ اس کے قہقہے پہلے سے زیادہ کھنکدار ہو گئے۔ چہرے کی پھٹکار چھپانے کے لیے میک اپ کی مقدار اتنی بڑھا دی کہ میں اپنی بالکنی سے اس کی مصنوعی پلکیں گن سکتی۔ پھر لمبی لمبی کاریں اس کے فلیٹ کے سامنے رین بسیرا لینے لگیں۔

اب شراب کے علاوہ اسے اور سارے نشوں کی لت پڑ گئی ہے۔ پینا تو احمد بھائی سکھا گئے تھے۔ دھتورے کے سگریٹ اس نے سورج مل جی سے سیکھے۔ کوکین کے انجکشنوں کا تحفہ راجہ صاحب نے دیا۔ سنکھیا ایک منچلے پر ڈبو مرنے چکھا دی۔ غرض ہر عاشق اسے کوئی نہ کوئی سہارا دیتا، تاکہ زندگی کی کڑواہٹ کچھ کم ہو جائے۔

احسان صاحب اب بھی پرانے زخم کی گھر دیکے کی طرح موجود ہیں۔ وہ اس خاندان کی جان کو ایک مستقل عذابِ الٰہی کی طرح لگ گئے ہیں۔ اب تو وہ اتنے قلاش ہو گئے ہیں کہ ان کے جال میں کوئی گاؤدی سیٹھ تو کیا مکھی بھی نہیں پھنستی وطن میں ان کی بیوی اور بچے فاقے کر رہے ہیں۔ اس لیے اب وہاں بھی نہیں جاتے اب انھیں یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا ہے، اگر وہ ایک وقت کا کھانا ایک شخص کے ہاں کھالیں تو کوئی کنگال نہیں ہو جائے گا، اس لیے وہ بھرے بھرے دسترخوان کی تاک میں رہتے ہیں۔ اب بھی کوئی الو پھنس جائے تو اپنے منصوبوں کا گٹھر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں:

"راجندر کمار کے پاس تو ڈیٹس نہیں۔ دلیپ اکتوبر سے پہلے ایک دن بھی نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد تو کہتا ہے کہ احسان صاحب جتنے دن چاہیں لگاتار شوٹنگ کر لیجیے گا۔ تین لاکھ پیشگی کا تو انتظام ہو گیا ہے۔ بس نوشاد صاحب مہابلیشور سے لوٹیں تو گانے ریکارڈ کرالوں گا۔"

مگر اب تو لوگوں نے چڑنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ان کی باتوں پہ نہ ہنسی آتی ہے نہ رونا۔ نیلوفر کے گھر میں تو بس اب وہ اوپر کے کام کے رہ گئے ہیں۔ شراب کباب کا انتظام کرنا، سوڈے کی بوتلوں اور برف کی دیکھ بھال، بچوں کی فیس یاد کر کے وقت پر بھجوانا، بینک کی دوڑ دھوپ کرنا، لانڈری سے کپڑے لانا لے جانا اور بیگم کے ساتھ سینما وغیرہ جانا۔

زبیدہ کی شادی پہ نیلوفر نے سب کا کہا سنا معاف کر دیا۔ سورج مل جی کے ہاتھ پیر جوڑ کر منا لائی۔ روشنی کا سارا انتظام انھیں کے سپرد تھا۔ احمد بھائی کے

ہاں خود شادی کا رقعہ لے کر گئی۔

"بھابی ضرور آئیے گا۔" اس نے ان کی بیوی سے اصرار کیا۔

راجہ صاحب کبھی بمبئی آئیں تو اس سے ملے بغیر نہیں جاتے۔ لوگ کہتے ہیں اسکے پاس جادو کی بوٹی ہے یا الہ دین کا چراغ، کوئی اس کے در سے نامراد نہیں جاتا۔ وہ خود نہیں تو اپنی کسی سہیلی کو فراہم کر دیتی ہے۔ حلیمہ کے پاس نہ علم ہے نہ حسن، دولھا کا بھاؤ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ جوڑا گھوڑا اور ولایت جانے کا خرچہ لے کر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ حلیمہ کے کنوارے رہنے کا سارا الزام نیلوفر کی جان پر ہے اگر وہ بدکار نہ ہوتی تو کوئی شریف زادہ مفت اسے بیاہ کر لے جاتا۔

سلیم کو لوگ رنڈی کا بھائی کہکر چڑاتے ہیں تو وہ خاموش، سر جھکا کر آنسو بہاتا ہے، تب نیلوفر کا کلیجہ کٹنے لگتا ہے اور وہ اسے موٹر سائیکل دلا کر بہلا دیتی ہے۔ زبیدہ کا میاں اسے بہن کی بدکاریوں کا طعنے دیتا ہے اور وہ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے، تب نیلوفر سچے موتیوں کی لڑیوں سے اس کے آنسو پونچھتی ہے۔ ابھی پچھلی عید پر اس نے روٹھے ہوئے بہنوئی کو منانے کے لیے اسے نئی موٹر لے کر دی۔ تب کہیں جا کر وہ سلام کرنے دو گھڑی کے لیے آ گیا۔

یہ اے روڈ ہے! شریفوں کا محلہ۔ یہاں سادھو سنت رہتے ہیں، جنھوں نے اپنے تپ کے زور سے سٹہ بازار سے لے کر عقبیٰ تک جیت لیا ہے۔ کچھ دین و دنیا کے ٹھیکیدار چور بازار کی دولت سے اونچی عمارتوں کو اور اونچا کر رہے ہیں۔ رشوت اور غبن کے بل پر شاندار ریسٹوران کھول رہے ہیں۔ انھیں نیلوفر کے چال چلن پر سخت اعتراض ہے اور اگر دوستوں کا معاملہ نہ ہوتا تو کب کے اسے شریفوں کی بستی

سے نکالنے کی یوجنائیں بنا ڈالتے ۔ کیونکہ نیلوفر بدکار ہے!

○ لیکن سورج مل جی تو دیش سیوک ہیں۔ آئے دن یتیم خانوں اور ودھوا آشرموں کا ادگھاٹن کرتے رہتے ہیں، جہاں ان کے گلے میں لمبے لمبے ہار پڑتے ہیں اور ہاتھوں میں گلدستے دیے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدکار نہیں!

○ احمد بھائی قومی اداروں میں انسانیت اور شرافت پر لیکچر جھاڑتے ہیں۔ لڑکیوں کے اسکول میں انعامات تقسیم کرتے وقت وہ بڑے چاؤ سے پیاری پیاری بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ شاید یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس میں سے کون اس قابل ہیں جنھیں نیلوفر بنایا جائے ۔ اس لیے وہ بدکار نہیں!

○ راجہ صاحب ملک کو انڈسٹریلائز کر رہے ہیں۔ اب ان کا کارخانہ بڑے زور شور سے ترقی کر رہا ہے۔ وہ چناؤ میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اسمبلی میں بیٹھ کر جنتا کی بھلائی کے لیے بڑے بڑے کام کریں گے۔ تمام دیوار پر چپکے ہوئے ان کے نام کے پوسٹروں میں ان کی قومی خدمات کی لمبی چوڑی فہرست موجود ہے۔ مگر کہیں اُن گم نام مستریوں کا ذکر نہیں جو لاپتہ ہو گئے، جنکے بال بچے سڑکوں پر رل گئے۔ اور نہ نیلوفر کے چندن ہار کا کہیں حوالہ دیا ہے ۔ کیونکہ راجہ صاحب بدکار نہیں! اور وہ دنیا، جو معصومہ کو نیلوفر بناتی ہے، بدکار نہیں! صرف نیلوفر بدکار ہے! وہ نیلوفر جو اپنے خاندان کی پالن ہار ہے۔ ان بچوں کی ناجائز ماں ہے۔ ان کی ان داتا ہے ۔ وہ بدکار ہے!

معصومہ ۔ نیلوفر! نیلوفر ۔ معصومہ!

جیسے چکّی کے ان دو پاٹوں کے بیچ پسنے والی شے انسان نہیں گھنا ہوا گیہوں کا ایک دانہ ہے ۔ جس نے احمد بھائی کو جھیل لیا، راجہ صاحب اور سورج مل کو

سہ لیا، زندہ موت سے سمجھوتا کر لیا، سنکھیا اور دھتورے سے سمجھوتہ کر لیا، اپنے سارے کینے کی زندگیوں کا زہر منتھ کر غٹا غٹ پی لیا۔

کبھی شام کو جب اس کے فلیٹ میں دھما چوکڑی مچی ہوتی ہے تو وہ بالکنی میں آکر چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی خالی خالی آنکھوں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی کے اس پار — دور کہیں خوابوں کے دیس میں — اپنی اس کنواری دنیا کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہے۔ جو لٹ گئی۔ وہ مہندی جو سوکھ کر ریت میں بکھر گئی۔ وہ شہنائیاں جن کے سر پھٹ گئے اور شہانہ جوڑا جو کفن بن گیا!

[illegible]

میری سولہ برس کی جیتی جاگتی بیٹی
نوعمر سہیلیوں کے ساتھ رسی کود رہی ہے
اے کاش میں واپس اسے اپنی کوکھ میں چھپا سکتی!

[illegible]

یہ دنیا عجیب و غریب ہے۔ ایک انجینیئر [illegible]

[illegible]

چند عمدہ ناولیں

ندی	عبداللہ حسین	۹ر روپے
ضبط کی دیوار	سلیم اختر	۹ر 〃
موراں والی	ہرنام داس صحرائی	۱۵ر 〃
بے جڑ کے پودے	سہیل عظیم آبادی	۱۴ر 〃
چراغ تہہ داماں	اقبال متین	۱۵ر 〃
غبارِ شب	قاضی عبدالستار	۳۰ر 〃
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۱۵ر 〃
طوفان حوادث	پروین سرور	۱۰ر 〃
ایک محبت کی کہانی	غازی صلاح الدین	۱۰ر 〃
آدھا راستہ	کرشن چندر	۲۵ر 〃

نصرت پبلشرز

امین آباد لکھنؤ

۲۲۶۰۱۸



عصمت چغتائی